جلد ۷۰ فروری ۱۹۶۹ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زرسالانہ: سات روپے فی پرچہ: ۵۰ پیسے

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۰	فروری ۱۹۶۹ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ	عدد ۶

اشارات	عبدالحمید صدیقی	۲
مقالات:		
مجلۃ الغرباء کا سوالنامہ اور اُس کا جواب	ابوالاعلیٰ مودودی	۱۳
سوشلزم	جناب نعیم صدیقی صاحب	۲۰
دورۂ ترکی کے مشاہدات	جناب خلیل حامدی صاحب	۳۲
اسلامی بین الاقوامی تنظیمات کی قرار دادیں		۴۶
رسائل و مسائل:		
خلافت و ملوکیت	ملک غلام علی صاحب	۵۳

سالانہ چندہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵- اے ذیلدار پارک- اچھرہ، لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلیشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ- لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

گزشتہ ماہ صدر مملکت نے کنونشن مسلم لیگ کی ایک مجلس سے خطاب کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی باتوں کا ذکر کیا، وہاں اسلامی قانون کے بارے میں بھی اظہار خیال فرمایا اور کہا کہ ہم سب کے لیے اسلام سے زیادہ کوئی چیز اہم نہیں اگر اس ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہو سکیں تو ہم سب کو بیحد اطمینان اور خوشی ہوگی لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ یہ مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہے اور اس کے حل کے لیے ضروری ہے کہ علماء و وکلاء اور جج صاحبان عوام کے مشورے سے کوئی ایسا قابل عمل مسودۂ قانون تیار کر دیں جو تمام فرقوں کے لیے قابل قبول ہو۔ اسمبلیاں اس کی منظوری دے دیں تو میں آنکھیں بند کر کے اس پر دستخط کر دوں گا۔ اور مجھے اس سے زیادہ کسی اور بات سے خوشی نہ ہوگی کہ پاکستان میں مکمل طور پر شرعی قانون کا نفاذ عمل میں آئے۔

صدر صاحب نے اس بیان میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے دل و جان سے آرزومند ہیں۔ بشرطیکہ ملک کے تمام طبقے، مذہبی فرقے اور قانون ساز ادارے کسی مجموعۂ قوانین پر سو فیصد متفق ہو کر صدر صاحب کی بارگاہِ عالیہ میں یہ عرض کر دیں کہ حضور ملک کی سو فیصد آبادی اس مسودۂ قانون پر مکمل اتفاق رکھتی ہے لہٰذا اب آپ بھی اس پر صاد فرما کر اس کا نفاذ کر دیں۔

صدر صاحب سے بصد احترام پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا دنیا میں کہیں بھی قانون سازی کا یہ انوکھا طریقہ اپنایا گیا ہے؟ اگر قانون کے نفاذ کا یہ طریقہ کہیں بھی رائج نہیں تو آخر اسے اسلامی قانون ہی کے معاملے میں کیوں پیش کیا جا رہا ہے؟ پھر صدر صاحب سے یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا آپ نے اپنے پسندیدہ دستور اور اپنے تجویز کردہ قوانین کو اسی طرح کی انہی شرائط کے ساتھ ملک میں نافذ فرمایا ہے؟ کیا ان کے نفاذ سے پہلے ان کے بارے میں تمام طبقوں سے

استصواب کر کے اس امر کا اطمینان کر لیا گیا تھا کہ ملک کی پوری آبادی ان پر کامل اتفاق رکھتی ہے؟ کیا ان پر علماء اور وکلاء اور جج صاحبان کی مہرِ تصدیق ثبت کرواکر اس ملک پر مسلط کیا گیا تھا؟ آخر آپ نے اپنے پسندیدہ دستور اور قوانین کے نفاذ میں ان ساری شرائط کو کیوں یکسر نظر انداز کر دیا؟

عوام کے حافظے بلاشبہ کمزور ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کے ذہن میں ابھی تک اُس آمرانہ طریق کے نقوش محفوظ ہیں جس کے مطابق ۱۹۶۲ء کے دستور کا نفاذ کیا گیا۔ اتنی بات تو بہرحال انہیں یاد ہے کہ آپ نے تشکیل دستور کے ابتدائی مراحل سے لے کر اس کے نفاذ تک عوامی احساسات کی کسی مرحلے پر بھی قطعاً کوئی پروا نہ کی اور اپنے ذاتی نظریات دستور کی صورت میں عوام پر ایک حکم کے ذریعے ٹھونس دیئے۔

دستوری کمیشن کو ترتیب دیتے وقت عوام سے کسی قسم کا کوئی مشورہ نہ کیا گیا اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ اپنی پسند کے آدمیوں کو اس میں شامل کیا جائے۔ اس کمیشن نے جو سوال نامہ جاری کیا اس کے جوابات بھیجنے کے معاملے میں عوام پر عجیب و غریب پابندیاں عائد کی گئیں۔ ان میں سے ایک پابندی یہ تھی کہ اس سوالنامہ کا جواب دینے میں ایک دوسرے سے مشورہ نہ کیا جائے اور اس کے کسی پہلو پر پبلک میں گفتگو نہ کی جائے بلکہ جن خوش نصیبوں کو یہ سوال نامہ وصول ہو وہ بھی اپنی آراء کو پوری طرح اخفا میں رکھتے ہوئے صرف کمیشن کو اپنے انفرادی خیالات سے آگاہ کریں۔ عوام کے لیے ایک نظامِ حیات مرتب کیا جا رہا تھا اور وہ بے چارے اس ساری کارروائی سے یکسر بے تعلق تھے۔ انہیں قطعاً علم نہ تھا کہ نوشتۂ دستور ان کے لیے کیا فیصلے کر رہا ہے۔

اس کارروائی کو عوام سے پوشیدہ رکھنے کے بارے میں حکومت اتنی چوکس تھی کہ جہاں ذرا بھی کسی نے لب کشائی کی وہیں اس سے بازپرس کی گئی۔ بعض افراد پر محض اس لیے مقدمات چلائے گئے کہ انہوں نے دستوری کمیشن کے سوالات کے بارے میں دوسرے افراد سے بات کر ڈالی۔ ان ایام میں حکومت کی پوری مشینری عوام کو دبانے میں غیر معمولی طور پر مستعد رہی۔ ان حالات میں جو دستوری سفارشات اس کمیشن نے مرتب کیں انہیں بھی بڑی حد تک نظر انداز کر کے ایک ایسا دستور تشکیل دیا گیا جس میں اقتدارِ اعلیٰ بلا شرکتِ غیرے صرف ایک فرد کے ہاتھ میں ہو اور

وہی ملک کے پورے سیاہ و سفید کا مالک ہو اور کوئی شخص یا ادارہ اس سے کسی قسم کی کوئی باز پرس نہ کر سکے۔ دستوری کمیشن نے آئین میں جن جمہوری دفعات کی سفارش کی تھی ان سب کو اس میں سے نکال دیا گیا۔ آئین کمیشن کی تجاویز کو کس متکبرانہ انداز کے ساتھ مسترد کیا گیا اس کا اندازہ اس کمیشن کے صدر جناب جسٹس شہاب الدین کے حالیہ بیان سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے بڑے واشگاف الفاظ میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ ان سفارشات کو قطعاً درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ خصوصاً ان کے ان حصوں کو تو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے جن میں صدر مملکت کے اختیارات محدود ہوتے ہوں یا عوام کے سامنے مسئولیت کا سوال پیدا ہوتا ہو۔

یہ آمرانہ روش اور عوامی احساسات سے یکسر بے پروائی کا انداز تدوینِ دستور کے مراحل تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آرڈی ننس کی تلوار کے ذریعہ اس کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ اس اہم اور نازک موقع پر کسی طبقہ سے بھی مشورہ کی ضرورت محسوس نہ کی گئی اور یکایک یہ قلادہ لوگوں کی گردنوں میں ڈال دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی متعدد دوسرے آرڈی ننس بھی نافذ کیے گئے تاکہ ساری قوم کو اچھی طرح جکڑ کر اس پر اس ناروا بوجھ کو لاد دیا جائے اور وہ نہ تو جنبش کر سکے اور نہ فریاد کر سکے۔ یونیورسٹی آرڈی ننس اور پریس آرڈی ننس اس دستور کے لازمی ضمیمہ کے طور پر اس کے ساتھ ہی نافذ کیے گئے تاکہ کسی طرف سے اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو سکے۔ صدر مملکت اپنے دلپسند نظریات کو تو عوام کی مرضی کے علی الرغم ملک میں اس آمرانہ انداز سے نافذ کرتے ہیں، مگر اسلامی دستور کے بارے میں ملک کی سو فیصد آبادی کے مکمل اتفاق کو شرط قرار دیتے ہیں۔ قول و فعل کا اس سے بڑا تضاد اور کہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کے اس طرز عمل کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ انہیں اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دستور عزیز ہے اور وہ اسی کے مطابق امور مملکت چلانا چاہتے ہیں۔ اسلامی دستور کے بارے میں ان کے دل میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات ہیں اور اسی بنا پر وہ اس کے نفاذ سے گریزاں ہیں۔ لیکن ان کے خیال میں چونکہ مسلمانوں کو اس مسئلہ سے ایک جذباتی لگاؤ ہے اس لیے وہ کھل کر اس کے خلاف کوئی بات کہنا نہیں چاہتے۔ انہوں نے ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ اسلامی دستور کے بارے میں دبے لفظوں میں اپنے شکوک کا اظہار کیا ہے اور اپنی الجھن کو الفاظ کے ہیر پھیر

کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک نیم مہذب معاشرے کے قوانین کو آج کل کے جدید معاشرے کے لیے کس طرح رہنما بنایا جا سکتا ہے۔

انہیں اسلامی دستور و قانون سے کتنی محبت ہے اور وہ اس کے نفاذ کے لیے کہاں تک دل کی گہرائیوں سے آرزومند ہیں، اس کے اندازے کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں بلکہ اسے سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے اُن دینی مسائل میں بھی عوام کے جذبات کا کہاں تک احترام کیا ہے جن پر پوری ملت کے اندر مکمل اتحاد و اتفاق ہے اور جنہیں فی الحقیقت پوری قوم کے دل کی آواز کہا جا سکتا ہے۔ عائلی قوانین کے خلاف ملک کے سارے مذہبی گروہوں اور فرقوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ کوئی ایک طبقہ بھی ایسا نہیں جس نے مذہبی اساس پر اس کی حمایت کی ہو۔ مگر اس معاملے میں مذہبی طبقوں کا مکمل اتحاد اور اُن کا پُر زور احتجاج بھی بالکل صدا بصحرا ثابت ہُوا۔ اگر مذہبی فرقوں کے درمیان افتراق صدر مملکت کے نزدیک اسلامی نظام کی راہ کا سنگِ گراں ہے اور وہ اسی بنا پر اس کے نفاذ میں متامّل ہیں تو انہیں کم از کم اسلام کی ایسی تعلیمات کو تو قانون کی حیثیت دینے میں قطعاً تامّل نہ کرنا چاہیے جن کے بارے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ شراب، قمار، رقص و سرود کی محفلوں کا انعقاد، زنا اور دوسری بے حیائیوں کا استیصال، رشوت ستانی کا قلع قمع، یہ چند مسائل تو ایسے ہیں جن کے بارے میں امت کے کسی طبقہ کے اندر کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ آخر ان پر عمل پیرا ہونے میں کونسی چیز مانع ہے۔

اس ضمن میں ذرا آپ اُن سفارشات کے متعلق بھی اپنے طرزِ عمل پر غور کریں جو آپ کی اپنی تشکیل کردہ مشاورتی کونسل نے آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ اس کونسل نے سُود، شراب، جُوے اور فحاشی کے بارے میں نہایت واضح طور پر بعض ایسی تجاویز مرتب کیں جن کی پوری امت نے تائید کی۔ ملک کے اخبارات اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ ان امور پر کونسل کی سفارشات کی ہر طبقے نے پذیرائی کی اور کسی ایک کونے سے بھی اختلاف کی کوئی آواز بلند نہ ہوئی لیکن آپ نے ان سفارشات کو بھی یا تو یکسر مسترد کر دیا یا انہیں سرد خانے میں ڈال دیا۔ اس سلسلے میں آپ کی حکومت کی طرف سے مشاورتی کونسل پر یہ پابندی بھی عائد کی گئی کہ وہ اپنی سفارشات کو پبلک کے سامنے نہ لائیں بلکہ انہیں

دفتری کارروائی کے مختلف مراحل میں سے گزار کر ریکارڈ آفس کی زینت بنا دیں حکومت کے اس فرمان کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کو یہ بات بھی گوارا نہیں کہ آپ کا اپنا قائم کیا ہوا ادارہ بھی کوئی ایسی بات سامنے لائے جس سے عوام کے دینی احساسات کی ترجمانی ہوتی ہو۔

صدر مملکت جب کبھی اسلامی دستور کا ذکر فرماتے ہیں تو مذہبی فرقوں کے اختلاف کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں گویا کہ ان کے درمیان ساری امت میں افتراق ہی افتراق ہے اور کسی ایک معاملے میں بھی مسلمان ایک دوسرے سے متفق نہیں۔ حالانکہ یہ بات حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ مسلمانوں کے تمام فرقوں کے درمیان اصولوں کی حد تک بے مثال اتفاق پایا جاتا ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ فروعات میں ہے۔ صاحب صدر جیسا ذہین آدمی غالباً اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ دستور اور قانونی تفصیلات میں نمایاں فرق ہے۔ دستور ہمیشہ اصولوں کی بنیاد پر مرتب کیا جاتا ہے اور باقی قانون سازی میں جزئیات طے ہوتی ہیں۔ دستور میں فقہی جزئیات کو سامنے نہیں رکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے چند سال بعد جب اس اختلاف کو آڑ بنا کر قوم پر لادینی دستور مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو ملک کے تمام فرقوں کے نامور علماء نے بیٹھ کر حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اسلامی دستور کے بنیادی اصول بالاتفاق طے کر کے حکومت کے سامنے پیش کر دیئے اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی نظام سے فرار کے لیے یہ عذر بالکل بے بنیاد ہے۔ ان اصولوں سے ملک کے ہر طبقے نے مکمل اتفاق ظاہر کیا۔ علماء نے اس معاملے میں جس فکری ہم آہنگی کا ثبوت دیا اُسے دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُن میں سے ہر ایک کے ذہن میں اسلامی دستور کا ایک واضح اور غیر مبہم نقشہ موجود ہے جسے بیٹھ کر سب نے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ آج تک ان بنیادی اصولوں کے بارے میں کسی فرقے نے اختلاف کی قطعاً کوئی بات نہیں کہی۔ اسی اجتماع میں علمائے کرام نے یہ بات بھی طے کر دی تھی کہ ملک کا قانون شریعت کی اسی تعبیر پر مبنی ہو گا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے اور قلیل التعداد فرقوں کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے پرسنل لا، یعنی اُن کی اپنی فقہ کے مطابق کیے جائیں گے۔ لہٰذا شریعت کے نفاذ میں مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کی بنا پر اگر کوئی رکاوٹ ہو سکتی تھی تو وہ پہلے ہی دُور ہو چکی ہے اور انگریزی محاورے کے مطابق علمائے امت نے مخالفین کے بادبانوں سے پہلے مرحلے پر ہی ہوا نکال دی۔ اس بنا پر

لادینی دستور کی کشتی مذہبی اختلافات کی آڑ لے کر اب آگے نہیں بڑھائی جا سکتی۔ اسے کھینچنے کے لیے اب کچھ دوسرے بہانے اور عذرات تراشنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کے اختلافات اسلامی نظام کی راہ میں نہ تو کبھی پہلے حائل ہوئے ہیں نہ اب ہو سکتے ہیں۔ اسلامی دستور قریب قریب بارہ صدیوں تک مذہبی اختلافات کے باوجود مسلمان حکومتوں میں نافذ رہا اور ان اختلافات کی بنا پر کبھی بھی اس سے انحراف نہ کیا گیا۔ اس نظام کا اصل مخالف مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ ہے جو نہ صرف دینی احساسات اور عوامی جذبات سے یکسر بیگانہ ہے، بلکہ غیر مسئول اقتدار کی چاٹ نے جس کے ذائقہ کو بگاڑ دیا ہے۔ یہ طبقہ شروع ہی سے اس امر کے لیے کوشاں رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس ملک میں اسلامی نظام کی جگہ ایک لادینی دستور نافذ کیا جائے اور اسے اسلام کا گہوارہ بنانے کے بجائے مغربی طرز کی لادینی ریاست بنا دیا جائے۔ اس ناپاک مقصد کے لیے یہ شروع ہی سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ مگر اسے خدا کے فضل کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک کی عظیم اکثریت نے دین پسند گروہ کی قیادت میں اس کے عزائم کو ہر مرحلے پر ناکام بنا دیا۔ شروع ہی میں جب ان نے لادینی ریاست کا تذکرہ شروع کیا تو عوام کی طرف سے ایک چار نکاتی مطالبہ پیش ہوا، جس میں حکومت سے یہ تقاضا کیا گیا کہ وہ غیر مبہم الفاظ میں اس بات کا اعلان کرے کہ ملک کا آئین کتاب و سنت کی بنیاد پر مرتب ہو گا۔ اور کوئی قانون اسلامی شریعت کے منافی وضع نہ کیا جائے گا۔ اس مطالبہ نے اتنی قوت اختیار کر لی کہ حکومت کو ۱۹۴۹ء میں قرار داد مقاصد منظور کرنی پڑی۔ ۱۹۵۰ء میں پھر مذہبی فرقوں کے اختلافات کا ذکر کر کے اسلامی دستور کی تشکیل کے کام کو تعطل میں ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن علمائے کرام نے اسلامی آئین کے ۲۲ بنیادی اصول طے کر کے اس مہم کو ناکام بنا دیا۔ ان اصولوں کی حیثیت اجماع کی سی ہے۔ پھر بھی یہ آویزش مسلسل جاری رہی یہاں تک کہ چودھری محمد علی صاحب نے ۱۹۵۶ء میں ملک کے سامنے ایک ایسا دستور پیش کیا جس میں اچھی خاصی حد تک ۳۱ علمائے کرام کے طے کردہ بنیادی اصولوں کو سمونے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا دستور تھا جس پر ملک کے سارے دین پسند طبقوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور اس یقین کے ساتھ اس کی تائید کی کہ اب ملت کے کارواں نے صحیح رُخ اختیار کر لیا ہے اور وہ جلد ہی منزلِ مقصود

کی طرف بڑھنا شروع کردیگا۔ اس میں قرآن و سنّت کو بطور اساس تسلیم کیا گیا تھا اور حکومت نے اپنے آپ کو اس بات کا پابند بنایا تھا کہ وہ اسلام کے بتائے ہوئے معروفات کو فروغ دے گی اور منکرات کو مٹانے کے لیے مؤثر قدم اٹھائیگی۔ اس میں شہریوں کے بنیادی حقوق بھی متعین کیے گئے تھے اور اسلام کی طرف سے عائد کردہ معاشرتی اور معاشی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کا بھی وعدہ کیا گیا تھا۔ پھر اس میں اقتدار کو بھی بعض ضابطوں کا پابند بنا کر آمریت کا سدِ باب کیا گیا تھا۔

جس وقت یہ دستور سامنے آیا اسی وقت سے اسے کالعدم قرار دینے کے لیے مغرب زدہ طبقے نے سازشیں شروع کردیں اور اسی سازش کے نتیجے میں عام انتخابات سے چند ماہ پیشتر ملک میں مارشل لا نافذ کرکے اس دستور کا خاتمہ کردیا گیا۔ صاحبِ صدر اگر چاہتے تو ۱۹۶۲ء کے نئے غیر جمہوری دستور کی جگہ ۱۹۵۶ء کا دستور بھی نافذ کرسکتے تھے جس پر عوام قریب قریب متفق ہوچکے تھے اور جسے علماء کرام نے بھی قبول کرلیا تھا۔ اگر اس انقلاب کا مقصد محض سابق سیاستدانوں سے ملک کو نجات دلانا تھا تو وہ سابق دستور کو قائم رکھ کر بھی اس کام کو سرانجام دے سکتے تھے۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس بساط کو اُلٹنے کا مقصد صرف اس دستور کو ختم کرنا تھا۔ کیونکہ سابق سیاستدانوں کی ایک معقول تعداد کو تو صدر صاحب نے سینے سے لگالیا ہے مگر ۱۹۵۶ء کے دستور کے جمہوری اور اسلامی عناصر میں سے کسی کو بھی نئے دستور میں راہ پانے کا موقع نہیں دیا۔ اس نئے دستور کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ دستور اس سابقہ دستور کی ضد میں مرتب کیا گیا ہے اور اس کا مقصد اس کی جمہوری اور اسلامی روح کو ختم کرکے ملک میں آمریت اور مغربیت کو فروغ دینا ہے۔

آج ہمارا ملک جن مصائب سے دوچار ہے اس کی بنیادی وجہ مغرب زدہ طبقے کی یہی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ مغربی نظریات اور مغربی تہذیب و تمدن کو تو وہ قوت کے بل بوتے پر اس ملک میں رائج کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام کو جو باشندگانِ ملک کی عظیم اکثریت کا متفقہ مطالبہ ہے اور جس کی خاطر پاک و ہند کے مسلمانوں نے بے مثال قربانیاں دے کر ایک الگ خطۂ ارضی حاصل کیا ہے، اسے وہ مختلف حیلوں بہانوں سے برابر ٹال رہا ہے۔

اس باہمی رسہ کشی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ملک میں ابھی تک کوئی ایسا دستور نافذ نہیں کیا جا سکا جسے یہاں کے عوام نے خوشدلی کے ساتھ قبول کر کے اس کے مطابق تعمیرِ نو کا کام شروع کیا ہو۔ مغرب زدہ طبقوں نے یہاں ہر گمراہی کو برداشت کیا بلکہ اُسے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے پُورے مواقع فراہم کیے۔ مگر اسلام کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس غیر دانشمندانہ طرزِ عمل کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔ یہاں نہ تو لادینیت ہی پوری طرح مسلط ہو سکی ہے اور نہ اسلامی نظام ہی قائم ہوا ہے۔ شروع سے ملک میں تعطل اور بے یقینی کی ایک فضا چلی آ رہی ہے۔

حکمراں طبقے اور عوام کو اس باہمی کشمکش میں مصروف دیکھ کر اور نظریاتی اعتبار سے میدان خالی پا کر اسلام دشمن عناصر نے حکومت کی محافظت میں بلکہ اس کی تائید کے ساتھ غیر اسلامی نظریات کا پرچار شروع کیا اور اس کے عبرتناک نتائج بھی اب کھل کر عوام کے سامنے آ گئے ہیں۔ غیر اسلامی قوتیں اب اتنی دلیر اور جری ہو گئی ہیں کہ اس خطۂ پاک میں علانیہ اسلام مردہ باد کے نعرے بلند کیے گئے ہیں۔ بعض لوگ اب اپنی مصلحتوں کی بنا پر اس بات کا انکار کر رہے ہیں کہ یہ نعرہ بلند نہیں کیا گیا تھا۔ مگر کراچی میں سینکڑوں سننے والے کان اس کے گواہ ہیں اور سینکڑوں دیکھنے والی آنکھیں ان لوگوں کو پہچانتی ہیں جنہوں نے یہ نعرے بلند کیے تھے۔

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ یہ نعرے کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت بلند کیے گئے یا یہ چند شوریدہ سر نوجوانوں کے وقتی جوش و خروش کا نتیجہ ہیں۔ اس سارے معاملے میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حکومت کی غلط روش نے معاملات کو کس حد تک بگاڑ دیا ہے۔ مارشل لا کے نفاذ تک اسلام دشمن عناصر اسلامی نظام کے احیاء کی کوشش دیکھ کر بڑے پیچ و تاب کھاتے رہے۔ چونکہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے مختلف انداز سے اس نظام کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں شکوک و شبہات بھی پیدا کرتے رہے۔ مگر آج تک ان عناصر کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ اسلام کے خلاف کھل کر کوئی بات کریں۔ ان کے غیظ و غضب کا ہدف علمائے دین (ان کی اصطلاح میں "ملا") تھے۔ وہ ان پر برستے رہے اور عوام کو یہ تاثر دیتے رہے کہ وہ حقیقت میں اسلام کے خلاف نہیں بلکہ اسلام کی اُس تعبیر کے خلاف ہیں جو مولوی پیش کرتا ہے۔ مگر اب بلی تھیلے سے باہر آ چکی ہے اور جو لوگ اس معاملے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا تھے اُنہیں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ لوگ اسلام کے کتنے خیر خواہ اور

اس سے کس قدر محبت کرنے والے ہیں، اور انہیں اللہ کا دین کارل مارکس، لینن اور ماؤ کے دین کے مقابلے میں کتنا عزیز ہے؟

ان لوگوں کے کام کرنے کا تکنیک بڑا گہرا اور عیارانہ ہے۔ یہ متعدد گروہوں میں بٹ کر معاشرے میں سرایت کرتے ہیں۔

ایک گروہ آمرانہ اقتدار کے گرد جمع ہو کر اس کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے، اور چونکہ اقتدار عوامی تائید سے محروم ہے اس لیے اسے ہر قدم پر اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کوئی بلند بانگ گروہ اس کی تعریف و توصیف کرے اور اس کی غلط اور احمقانہ پالیسیوں کو سراہے۔ یہ گروہ آگے بڑھ کر اس کی اس ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔ یہ ایک طرف اسے برابر یہ باور کراتا ہے کہ تم ایک بڑے کامیاب حکمران ہو تمہارا اقبال دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ چند رجعت پسند لوگ تمہیں خواہ مخواہ بدنام کرنے میں لگے ہوئے ہیں، مگر تمہیں ان کی کوئی پروا نہ کرنی چاہیے بلکہ انہیں سختی سے دبا دینا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک تو قوت کے زور سے اختلاف کی ہر آواز کو دباتا ہے اور دوسرے اِن لوگوں کے بھرّے میں آکر من مانی کارروائیاں کرتا ہے۔ یہ لوگ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر اقتدار کو عوامی احساسات سے بالکل بے تعلق بنا دیتے ہیں۔ جلد ہی ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ اسے عوام کے جائز مطالبات میں بھی شورش اور سماج دشمن سرگرمیوں کا عکس نظر آنے لگتا ہے اور وہ ہر اس بات کو اپنے خلاف سازش سمجھ بیٹھتا ہے جو اس کی حمایت کے سوا کہی گئی ہو۔ وہ عوامی مطالبے کو خواہ وہ کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو پائے استحقار سے ٹھکراتا ہے اور ہر جائز مسئلے کو اپنے وقار اور حکومت کے وقار کا مسئلہ بنا کر دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح عوام سے بے تعلقی آہستہ آہستہ عوام دشمنی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور خواہ تقریروں میں اپنے آپ کو عوام کا خادم ہی ظاہر کیا جائے مگر دنیائے عمل میں ان کے ساتھ دشمنوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس سارے ڈرامے میں اس اسلام دشمن گروہ کی صرف یہ کوشش ہوتی ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ ہمیشہ عوام کے خلاف صف آرا رہے۔ اس فضا میں ملک کے اندر جبر و استبداد کا بڑھنا ایک فطری امر ہوتا ہے۔ پھر حکومت کی غلط بخشیوں کی وجہ سے معیشت کا توازن بھی بگڑتا ہے۔ قومی دولت کا بیشتر حصہ ایک مختصر سے طبقے کے اندر محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور اکثریت زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ بلکہ

اُسے نانِ جویں بھی میسر نہیں آتی جس سے وہ جسم و روح کے رشتہ کو قائم رکھ سکے۔

دوسرا طبقہ اپنے پہلے کالم کی اس تدبیر سے فائدہ اٹھا کر امیری و غریبی کی لڑائی کے محاذ پر کام شروع کرتا ہے اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ حکمران طبقے کے خلاف عوامی نفرت اور حقارت کے جذبات کو اُن اقدار کے خلاف اُبھارنے میں مصروف ہو جاتا ہے جو اس قوم کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا سرمایہ ہیں، تاکہ قوم اپنے ماضی سے کٹ جائے، اپنے افکار و نظریات سے رشتہ منقطع کرلے، اپنے دین اور ایمان سے تہی دست ہو کر فکر و احساس کے اعتبار سے بالکل آوارہ ہو جائے، یہاں تک کہ اشتراکیت کے تھپیڑے اسے جس طرف چاہیں بہا کر لے جائیں۔ یہ طبقہ سرمایہ داری کے زخم خوردہ لوگوں کا چارہ ساز بن کر سامنے آتا ہے اور انہیں اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ وہ اس کے دکھوں کا مداوا کرنا چاہتا ہے۔ پھر جب وہ ان کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے تو بڑی چالاکی کے ساتھ ان کے اندر الحاد کا پرچار کرتا ہے اور ان کے رستے ہوئے زخموں پر دستِ شفا رکھنے کے بجائے ان کے دل و دماغ میں اشتراکیت کے جراثیم اتارتا ہے۔ وہ انہیں اس فریب میں مبتلا کرتا ہے کہ سرمایہ داری اور دین، دونوں ایک ہی ہیں۔ اور سرمایہ داری کی وجہ سے تم جن مصائب میں گرفتار ہو وہ درحقیقت دین کے ساتھ وابستگی کے طبعی نتائج ہیں۔ دین استحصال اور لوٹ کھسوٹ اور کمزوروں پر ظلم و زیادتی کا علمبردار ہے۔ اور دین دار طبقے سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں۔ ان نظریات کو بڑے سلیقے اور چالاکی کے ساتھ مظلوم طبقوں میں پھیلایا جاتا ہے اور وہ ان باتوں سے متاثر ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کے حقیقی خیر خواہ دین کے حامی طبقے نہیں بلکہ اشتراکیت کے رہنما ہیں، اور ان کی اصلاحِ حال کی کوئی صورت بجز اس کے ممکن نہیں کہ اشتراکیت کو اپنا لیا جائے اور دین اور اس کے ماننے والوں کا خاتمہ کیا جائے۔ کیونکہ "رجعت پسند" ہونے کی وجہ سے یہ لوگ ان کی معاشی فلاح کی راہ میں حائل ہیں۔

سرمایہ داری اور جاگیرداری کو یہ اشتراکی خود کس قدر لعنت سمجھتے ہیں اور اسے انسانیت کے لیے کس حد تک تباہ کن خیال کرتے ہیں، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں سرخ فوج کے نامور سپہ سالاروں کی عظیم اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو خود بڑے بڑے سرمایہ دار اور کارخانہ دار اور جاگیردار ہیں۔ جن کی اپنی زمینوں اور

کارخانوں میں مزارعین اور مزدوروں کا خون پورے جبر و استبداد کے ساتھ چوسا جاتا ہے۔ غریبوں اور ناداروں کے ان ہی خواہوں کے زیر اثر کام کرنے والے اپنے آپ کو ہی عذاب اور اپنی محرمیوں اور انہی مظالم کا شکار پاتے ہیں جن کی وجہ سے سرمایہ داری کو قابل نفرت گردانا جاتا ہے۔ سرمایہ داری ہمارے نزدیک واقعی ایک لعنت ہے جس کا خاتمہ ضروری ہے۔ معاشرے میں معاشی عدل و انصاف فی الحقیقت انسانیت کی بنیادی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ سرمایہ پرستی اور معاشی ناہمواری نے عوام کی زندگیوں کو ایک دردناک عذاب بنا دیا ہے۔ مگر ہم اسے دنیا کا سب سے بڑا فریب سمجھتے ہیں کہ جو لوگ خود سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں وہ اشتراکیت کے علمبردار بن کر اٹھیں اور عوام کو یقین دلائیں کہ ان کے دکھوں کا مداوا اسلام کے ذریعہ سے نہیں بلکہ اشتراکیت کے ذریعہ ہی سے ہوگا۔ ہم اسے عوام کی ہمدردی کے بجائے دین کے خلاف ایک سازش سمجھتے ہیں۔ اشتراکی ممالک اور "اشتراکی سرمایہ داروں" کی جو کارروائیاں اب تک منظر عام پر آتی ہیں انہیں دیکھ کر ہمیں اس بات کا پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس تحریک کا اولین مقصد اسلام کے خلاف بغاوت ہے۔

اس ملک میں اشتراکیت کا دم بھرنے والے آخر کتنے ایسے جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں جنہوں نے اپنے عمل سے اپنے خلوص کا ثبوت دیا ہو اور اپنی زمینوں اور کارخانوں اور اپنے سرمائے کو اپنے مزارعین اور مزدوروں اور غریبوں میں تقسیم کر دیا ہو؟ یا کسی اشتراکی سرمایہ دار نے قومی فلاح و بہبود یا مزدوروں اور مزارعین کی بہتری کے لیے کوئی ادارہ ہسپتال یا مکتب قائم کیا ہو؟ آخر کیا وجہ ہے کہ ان لوگوں کی ساری توجہ مذہب اور مذہبی طبقوں کے خلاف نفرت پھیلانے ہی میں صرف ہوتی ہے اور خستہ حال طبقوں کے مصائب دور کرنے کے لیے عملی طور پر ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جاتا؟ کیا یہ حقائق اس حقیقت کی غمازی نہیں کرتے کہ اشتراکیت کی اصل دشمنی سرمایہ داری سے نہیں بلکہ مذہب سے ہے؟ اور غریبوں اور مزدوروں کی محبت محض ایک ڈھونگ ہے جس کے پیچھے اسلام دشمنی کا مذموم جذبہ پوری قوت سے کارفرما ہے؟

کتنے ہی ممالک ایسے ہیں جن میں اشتراکی انقلاب آیا اور کتنے ہی معاشرے ایسے ہیں جنہیں اشتراکیت نے زیر و زبر کیا۔ ان سب میں مذہب اور خاص طور پر اسلام کا جو حشر ہوا وہ اس تحریک کے مزاج اور مقصد و منہاج کو سمجھنے

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

مُجلّۃ الغُرباء کا سوالنامہ اور اُس کا جواب

[لندن سے ایک رسالہ عربی زبان میں مجلۃ الغُرباء کے نام سے نکلتا ہے جسے ان عرب طلبہ نے جاری کیا ہے جو برطانیہ میں مقیم ہیں اور اپنی دوسری مصروفیتوں کے ساتھ اسلام کی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔ اِس رسالے نے مولانا مودودی سے ان کے زمانۂ قیام لندن میں چند سوالات کیے تھے جن کا جواب انہوں نے وہیں دے دیا تھا۔ ذیل میں یہ سوالنامہ اور اس کے جوابات درج کیے جا رہے ہیں۔ ادارہ]

سوالنامہ

۱۔ الغُرباء اسلام پسند طلبہ کا مجلّہ ہے اور برطانیہ سے عربی زبان میں نکلتا ہے۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ آپ قارئین مجلّہ کو جماعت اسلامی پاکستان کے حالات سے مختصراً آگاہ فرمائیں۔

۲۔ پاکستانی مسلمانوں کے اندر مختلف مذہبی تصورات پائے جاتے ہیں، جماعت اسلامی نے اختلافِ مذاہب کے مسئلہ کو کس طرح حل کیا ہے؟

۳۔ موجودہ حالات میں وہ کونسا اہم ترین میدانِ کار ہے جس پر اسلامی تحریک کو اپنی تمام تر کوششیں مرکوز کر دینی چاہییں؟ کیا سیاسی میدان؟ یا تعلیمی میدان؟ یا کوئی اور میدان؟

۴۔ اسلامی تحریک کی ایک متحدہ عالمی قیادت قائم کرنے پر مدت سے سوچ بچار ہو رہا ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

۵۔ عالم اسلام اس وقت جن حالات سے گزر رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہیں۔ اِن حالات میں امورِ ذیل کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

الف: مسلمان سربراہوں کی کانفرنس کا انعقاد،

ب ۔ مشترکہ اسلامی منڈی کا قیام،

ج ۔ بین الاقوامی اسلامی نیوز ایجنسی کا اجراء۔

۶ ۔ اسلامی تحریکیں اس وقت جگہ جگہ حکومتوں کے جبر و تشدد کی فضا میں سانس لے رہی ہیں، چنانچہ آپ کی نظر میں وہ کونسا مناسب ترین رویہ ہے جو اسلامی تحریکوں کو ان حکومتوں کے بارے میں اختیار کرنا چاہیے؟

۷ ۔ آپ کی رائے میں اسلامی تحریک کو مغربی ممالک میں کس اہم پہلو پر زیادہ زور دینا چاہیے؟

۸ ۔ مغرب میں کام کرنے والے داعیانِ اسلام کے لیے آپ کے مشورے کیا ہیں؟

۹ ۔ دو حرفی سوال ہے کہ بیت المقدس کی واگزاری کا صحیح راستہ کیا ہے؟

۱۰ ۔ آپ کے قلم نے اسلامی نظریات اور اسلامی تاریخ کے متعدد گوشوں پر وافر لٹریچر فراہم کر دیا ہے۔ مگر ابھی تک سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر آپ کی کوئی کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی۔ کیا آپ اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

۱۱ عہدِ حاضر کے اسلامی مفکر ہونے کی حیثیت سے کیا آپ نے اپنے دور میں اسلامی نظریہ کے اندر کوئی تبدیلی یا ترقی محسوس کی ہے؟

۱۰ ۔ اسلامی مفکرین نے موجودہ صدی میں، بلکہ کسی حد تک گزشتہ صدی میں بھی متعدد مغربی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ مثلاً ڈیموکریسی، نیشنلزم، وطنیت، پارلیمنٹ، دستور، سوشلزم وغیرہ۔ یہ اصطلاحیں ماضی قریب کے زمانے تک برابر استعمال ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض اسلامی مفکرین ان اصطلاحوں کے استعمال سے گریز کرتے ہیں، بلکہ اسلامی نظام کی تشریح میں ان اصطلاحوں کو اختیار کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان کا رجحان ہی نہیں بلکہ اصرار ہے کہ خالص اسلامی اصطلاحات کو استعمال کرنا چاہیے جو قرآنِ کریم اور سنتِ رسولؐ سے ماخوذ ہوں۔ کیا آپ اپنے تجربات اور اسلامی احساسات کی روشنی میں بتا سکتے ہیں کہ ہماری آئندہ نسلوں میں ایسے اسلامی مفکرین پیدا ہوں گے جو ہر اُس چیز کو کلّیۃً رد کر دیں گے جو قرآن و سنت سے خارج ہوگی۔ اور اسلامی شریعت، احکام قرآن اور دیگر اسلامی معاملات کے بارے میں کسی بحث و جدال کو برداشت نہیں کریں گے، بلکہ ان تمام چیزوں کو اسی طرح اصل حالت میں اختیار کریں گے جس طرح

دعوتِ اسلامی کے آغاز میں ان کو اختیار کیا گیا تھا ؟

۱۳ - دنیائے اسلام میں بیشتر لوگ اس خیال کا اظہار کر رہے ہیں، کہ ظہورِ مہدی (جس کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے) سے پہلے جس قسم کے حالات کی خبر دی گئی ہے وہ اس زمانے میں رونما ہو چکے ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟

۱۴ - مسلم اور اسلامی کے درمیان کیا فرق ہے ؟ کیا ان دونوں لفظوں کا استعمال درست ہے ؟

جواب

۱ - مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ برطانیہ میں آپ لوگ مجلۃ الغرباء کے نام سے ایک عربی پرچہ شائع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی کوششوں میں برکت دے اور آپ اس پرچے کے ذریعے سے طلبہ میں اسلامی روح بیدار کرنے اور بیدار رکھنے کے لیے کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔

جماعت اسلامی کے متعلق تمام ضروری معلومات آپ کو جماعت کے ایک ممتاز کارکن پروفیسر غلام اعظم صاحب (جنرل سیکرٹری جماعت اسلامی مشرقی پاکستان) کی ایک تازہ کتاب سے حاصل ہو سکتی ہیں جو حال میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی ہے[1]۔ اس کا ایک نسخہ اس جواب کے ساتھ آپ کو مہیا کیا جا رہا ہے۔

۲ - پاکستان میں اس وقت تین ہی فقہی مذاہب ہیں۔ ایک حنفی، دوسرے اہل الحدیث، تیسرے شیعہ امامیہ۔ ان تینوں مذاہب کے علماء نے ۱۹۵۱ء میں باہم اتفاق سے یہ بات طے کر لی تھی کہ ملکی قانون (LAW OF THE LAND) اکثریت کے مسلک پر مبنی ہوگا، اور ہر فقہی مذہب کے پیروؤں کو یہ حق دیا جائے گا کہ ان کے شخصی معاملات ان کے اپنے پرسنل لا کے مطابق طے کیے جائیں۔ رہے مختلف مذاہب کے اعتقادی اختلافات، تو نہ وہ دُور کیے جا سکتے ہیں، نہ اُن کو دُور کرنا ضروری ہے۔ صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہر گروہ اپنے عقیدے پر قائم رہے اور سب ایک دوسرے کے ساتھ رواداری برتیں۔ اس کے لیے

[1] کتاب کا نام ہے : A GUIDE TO THE ISLAMIC MOVEMENT

جماعت ملک میں مسلسل کوشش کر رہی ہے۔

۳- اسلامی تحریک کے لیے ساری دنیا میں کوئی ایک لگا بندھا طریق کار نہیں ہو سکتا۔ مختلف ممالک کے حالات مختلف ہیں، اور ہر جگہ کام کرنے والوں کو اپنے حالات کے مطابق ایک طریقِ کار اختیار کرنا ہوگا۔ البتہ جو چیز مشترک رہے گی وہ اصول اور مقصد ہے جس کا منبع قرآن و سنّت ہے اور وہی تحریک اسلامی کے تمام کارکنوں کو ایک وحدت میں منسلک کرتا ہے۔ جو گروہ جس ملک اور معاشرے میں اس تحریک کے لیے کام کرنے اُٹھے، اس کا یہ فرض ہے کہ اعتقاد اور عمل میں کتاب و سنّت کی تعلیمات کا پُورا اتباع کرے، اور اقامتِ دین کو اپنا مقصود بنا کر اپنی تمام مساعی اس پر مرکوز رکھے۔ اس کے بعد اپنی تحریک کے لیے عملی پروگرام طے کرنا ہر علاقے کے لوگوں کا اپنا کام ہے، اور ان میں اتنی حکمت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی قوت، ذرائع اور حالات کے لحاظ سے اقامتِ دین کے لیے مناسب ترین طریقِ کار تجویز کریں۔

۴- جن حالات سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں، ان میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دنیا کے تمام ممالک کے لیے اسلامی تحریک کی کوئی ایک مرکزی قیادت قائم ہو سکے۔ بلکہ اس وقت کے بین الاقوامی حالات تو اتنی بھی اجازت نہیں دیتے کہ ہمارے درمیان کوئی مراسلت اور تبادلۂ خیالات ہو سکے، یا ہم وقتاً فوقتاً کوئی مشترک کانفرنس کر سکیں سردست زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنی مطبوعات کے تبادلے کر کے ایک دوسرے کے حالات و خیالات سے واقف ہوتے رہیں، اور جہاں تک ممکن ہو، حج کے اجتماع سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔

۵- عالمِ اسلام کو اس وقت نہ صرف اِن تینوں اُمُور کی ضرورت ہے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں جو مسلم ممالک کو باہم مل کر کرنے چاہییں۔ دو سال پہلے مَیں نے اس کے متعلق ۲۱ نکات پر مشتمل ایک پروگرام پیش کیا تھا۔ لیکن اس طرح کی تجویزیں اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتیں جب تک مسلمان ملکوں کی حکومتیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں نہ ہوں جو اسلام کے رشتے کی بنا پر باہم متفق و متحد ہونے کے لیے تیار ہوں۔ سردست تو وہ "رجعت پسند" اور "ترقی پسند" کے جھگڑوں میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے ملکوں میں آئے دن انقلاب برپا کرنے سے ان کو فرصت نہیں مل رہی ہے۔

۶- میرے نزدیک یہ طے کرنا ہر ملک کی اسلامی تحریک کے کارکنوں اور قائدین کا کام ہے کہ جس قسم کا ظلم و

استبداد ان پر مسلط ہے اس کے مقابلہ میں وہ کس طرح کام کریں۔ ہر ملک میں اس کی صورتیں اور کیفیتیں اتنی مختلف ہیں کہ سب کے لیے کوئی ایک طریق عمل تجویز کرنا مشکل ہے۔ البتہ جو چیز میں ان سب کے لیے ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کو خفیہ تحریکات اور مسلح انقلاب کی کوششوں سے قطعی باز رہنا چاہیے اور ہر طرح کے خطرات و نقصانات برداشت کر کے بھی علانیہ پرامن اعلائے کلمۃ الحق کا راستہ ہی اختیار کرنا چاہیے، خواہ اس کے نتیجے میں ان کو قید و بند سے دوچار ہونا پڑے یا پھانسی کے تختے پر چڑھ جانے کی نوبت آجائے۔

۷۔ مغربی ممالک میں جو لوگ اسلامی تحریک کا کام کریں ان کو چاہیے کہ پہلے عملاً اپنی زندگی کو ٹھیک ٹھیک اسلامی سانچے میں ڈھالیں اور مغربی سوسائٹی کے اندر اپنی امتیازی شان نمایاں کریں۔ اہلِ مغرب کے ساتھ اخلاق اور اعمال اور طرزِ زندگی میں ہم رنگ ہو جانے کے بعد ان کی تحریک کے مؤثر ہونے کے امکانات آدھے سے زیادہ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری چیز یہ ہے کہ ان کو اہلِ مغرب کی تہذیب اور ان کے مذہب اور ان کے فلسفۂ حیات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے اور پھر ایسے حکیمانہ طریقہ سے تنقید اور تبلیغ کرنی چاہیے جس سے مغربی ممالک کے سنجیدہ طبقے اسلام کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ آپ کا کم سے کم ہدف یہ ہونا چاہیے کہ جس مغربی ملک میں بھی آپ ہوں وہاں کے کم از کم دو چار اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں کو اسلام کی طرف کھینچ لیں اور ان کو اسلامی تحریک کے لیے عملاً کام کرنے پر آمادہ کر دیں۔ اس کے بعد یہ اُن کا کام ہوگا کہ اپنے ملک میں دعوتِ اسلامی کے کام کی ذمہ داری سنبھال لیں۔

۸۔ سوال نمبر ۸ کا جواب اُوپر آچکا ہے۔ میرے نزدیک کسی مغربی ملک میں کام کرنے والے داعی اسلام کو مشرقی ممالک میں کام کرنے والوں سے بھی بڑھ کر اسلامی احکام کا سخت متبع ہونا چاہیے۔

۹۔ بیت المقدس کی واپسی کا کوئی امکان میرے نزدیک اُس وقت تک نہیں ہے جب تک فلسطین کے گرد و پیش کی عرب ریاستیں اپنی اُس روش کو چھوڑ نہ دیں جس کی وجہ سے انہوں نے ۱۹۴۸ء سے اب تک پے در پے یہودیوں سے شکستیں کھائی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ بیت المقدس کسی سیاسی تصفیے کے ذریعہ سے اب مسلمانوں کے قبضے میں واپس نہیں آسکتا۔ اس کے لیے لامحالہ لڑنا ہوگا اور اتنی طاقت سے لڑنا ہوگا کہ اسرائیل کو پوری شکست دی جا سکے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ شام، عراق، مصر اور اُردن میں اس وقت جو حالات پائے

جانتے ہیں ان میں جنگ کا نتیجہ بیت المقدس کی واپسی کے بجائے رہے سہے کچھ مزید علاقے کھو دینے کی صورت میں رونما ہو گا۔ رہے دوسرے اسلامی ممالک۔ تو وہ اسرائیل کے خلاف کوئی عملی اقدام نہیں کر سکتے جب تک وہ عرب ملک اُن کا تعاون حاصل کرنے کے لیے تیار نہ ہوں جن کی سرحدیں اسرائیل سے ملتی ہیں۔

۱۰۔ میں ایک مدت سے یہ تمنا رکھتا ہوں کہ سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی کتاب لکھوں، مگر مجھے ابھی تک اس کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ بسر دست میں نے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کی جو تفسیر آج کل میں لکھ رہا ہوں اس میں قرآن اور سیرت کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے اُن حالات کی تفصیل بیان کرتا جاؤں جن میں قرآن مجید کی آیات مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس تفسیر کی تکمیل کے بعد اگر مجھے اتنی مہلت اور طاقت دی کہ میں سیرتِ پاک پر بھی کوئی مستقل کتاب لکھ سکوں تو میرے لیے یہ بہت بڑی سعادت ہو گی۔

۱۱۔ میں نے پچھلے ۴۰ سال میں فکرِ اسلامی کے اندر مسلسل ایک تغیر محسوس کیا ہے، اور الحمدللہ کہ وہ بہتری کی طرف ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اب بہت زیادہ واضح شکل میں اسلامی تصورات دنیا کے سامنے آ رہے ہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں مغربی مستشرقین کے شاگردوں نے بھی پہلے سے بہت زیادہ پُرفریب اور بظاہر علمی طریقے اختیار کر کے اسلام اور اس کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوششیں کی ہیں، مگر ہر مرحلے پر ان کی سرکوبی کی جاتی رہی ہے اور کم از کم مسلمان آبادیوں پر وہ اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ مسلمان بالعموم اب اسلام کو اتنی صاف شکل میں جان اور پہچان رہے ہیں کہ ان کو یہ مشرقی مستغربین دھوکا نہیں دے سکتے۔

۱۲۔ موجودہ زمانے کے لوگوں کو بات سمجھانے کے لیے جدید اصطلاحات کا استعمال تو ناگزیر ہے، لیکن ان کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض اصطلاحوں سے پرہیز اولیٰ ہے، بلکہ اجتناب واجب ہے۔ مثلاً اشتراکیت۔ اور بعض کا استعمال اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ ان کے اسلامی مفہوم اور مغربی مفہوم کا فرق پوری طرح واضح کر دیا جائے، مثلاً جمہوریت، یا دستوریت، یا پارلیمنٹری سسٹم۔ اور بعض کو سرے سے کوئی اسلامی مفہوم دیا ہی نہیں جا سکتا، مثلاً نیشنلزم۔

۱۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئیاں ارشاد فرمائی ہیں ان میں سے کسی کے ظہور کی تاریخ بھی نہیں بتائی گئی ہے بلکہ صرف ان حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں کوئی واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اس طرح

کے بیانات کی بنا پر قطعیت کے ساتھ کسی وقت بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کس پیشین گوئی کا ظہور ہو جائیگا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم جن حالات کو دیکھ کر یہ رائے قائم کریں کہ یہ فلاں پیشین گوئی کے ظہور کا وقت ہے، ان کے بارے میں ہمارا اندازہ غلط ہو۔ ویسے تو ظہورِ قیامت کی علامات بھی اب بڑی حد تک دنیا میں پائی جاتی ہیں، لیکن قطعیت کے ساتھ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ اب اس کے برپا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

۱۴۔ مُسلم اور اسلامی میں ایک لحاظ سے تو کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ مسلم حقیقت میں کہتے ہی اس کو ہیں جو اسلام کا متبع ہو۔ لیکن ایک دوسرے لحاظ سے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ مسلم ہر اُس گروہ یا شخص کو کہا جا سکتا ہے جو دائرۂ اسلام سے خارج نہ ہو، خواہ وہ عملاً اسلام کی پیروی نہ کر رہا ہو۔ اور اس کے برعکس اسلامی صرف وہی چیز ہے جو ٹھیک ٹھیک اسلام کے مطابق ہو۔ مثلاً ایک مُسلم حکومت ہر اُس حکومت کو کہا جا سکتا ہے جس کے حکمران مسلمان ہوں لیکن اسلامی حکومت صرف اُسی کو کہا جا سکتا ہے جو اپنے دستور اور اور قوانین اور انتظامی پالیسی کے اعتبار سے پوری طرح اسلام پر قائم ہو۔

خریداران ترجمان سے گذارش

خریداران ترجمان سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت چِٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں جو کہ اُن کے پتہ کی چِٹ پر درج ہوتا ہے۔ بصورتِ دیگر دفتر عدمِ تعمیل کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

سوشلزم

پاکستان پر تسلّط کا نیا دعویدار!

از جناب نعیم صدیقی صاحب

ایک ملک و قوم کے لیے اس سے زیادہ تشویشناک صورتِ حال کوئی نہیں ہو سکتی کہ بیس اکیس برس گزر جانے پر بھی کچھ لوگ بار بار یہ بحث اٹھانے کی کوشش کرتے رہیں کہ اس کی بنیاد کس نظریۂ حیات پر ہے، اور اس میں کونسا نظام چلنا چاہیے۔ مملکت کی بنیادوں کے ساتھ اِس دل لگی کا روادار کوئی ایسا شخص نہیں ہو سکتا جو ملک کا سچا بہی خواہ ہو۔

صورت یہ نہیں ہے کہ پہلے سے ہمارے سامنے کوئی تصور موجود نہ ہو، اور ایک ذہنی خلا پایا جاتا ہو، اور اب مختلف نظریات اُبھر اُبھر کے آئیں اور اپنی اپنی جگہ اِس خلاء کو بھرنے کی کوشش کریں۔ ایسی صورت یہاں ہرگز نہیں ہے۔

آپ کا اگر حافظہ ساتھ دے! اگر آپ کا حافظہ ساتھ دے تو سلسلۂ واقعات یہ ہے کہ تشکیلِ پاکستان جس تحریک کے تحت ہوئی اس نے اسلامی مملکت بنانے اور اسلامی تہذیب کو قائم کرنے کے وعدے پر عوام کو اپنے ساتھ لیا اور ان کو سرگرمِ عمل کیا۔ اس تحریک کے قائدین ـــــ قائداعظم سے لے کر تمام بڑے اور چھوٹے، مرکزی اور علاقائی لیڈروں تک ـ نے اسلامی حکومت قائم کرنے کے بار بار اعلانات کیے اور قراردادیں پاس کیں۔ پھر انہی اعلانات کو دستوری شکل دینے کے کام میں جب سیکولر ذہنیت کے ایک قلیل گروہ نے اندر ہی اندر رکاوٹیں پیدا کیں اور قوم کے اِس اہم ترین بنیادی مسئلے کو التوا میں ڈالا تو اپریل ۱۹۴۸ء سے یہ مطالبہ اُبھرا کہ دستور ساز اسمبلی اسلامی اصولوں پر دستور بنانے کا آئینی فیصلہ کرے۔ یہ مطالبہ قومی امنگوں سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ ایک ہمہ گیر تحریک میں بدل گیا جس کے نتیجے میں پاک دستور یہ نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرارداد مقاصد پاس کر کے خدا کی حاکمیت اور قانونِ شریعت کو دستور کا اصل الاصول قرار دیا۔ پھر قوم کے تمام فرقوں کے ۳۱ علماء نے جنوری ۱۹۵۱ء میں اسلامی دستور کے لیے ۲۲ اصول

بالاتفاق طے کر دیئے۔ اس کے بعد ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو قرارداد مقاصد پر مبنی دستور پاس کیا گیا۔ بعد میں اگرچہ جمہوری طریق سے بنے ہوئے اس دستور کو برطرف کر کے مارشل لا لگا دیا گیا اور نئی طاقت نے نئے ماحول میں اپنی مرضی کا دستور نافذ کر دیا۔ لیکن اس نئے دستور میں بھی قوم کے اجتماعی عقیدہ کے مطابق اسلامی اصول و مقاصد کو اسی طرح برقرار رکھا گیا اور مملکت کا نام بھی اسلامی جمہوریۂ پاکستان طے کیا گیا جس طرح دستور ۱۹۵۶ء میں تھا۔

یہ مذاق نہیں چل سکتا! اب یہ ایک عجیب صورتِ حال ہے کہ ایک طرف بار بار اسلام کا نام لیا جاتا ہے اور ملک کو اسلامی ملک کہا جاتا ہے، اور دوسری طرف ایک عنصر بار بار اسلام کے مقابل میں ایک دوسرا نظریہ لا لا کے عوام کو الجھن میں ڈالتا ہے کہ گویا ابھی ملک و قوم کے نظریۂ حیات کا سوال حل طلب ہے، اور کوئی چیز کبھی طے ہی نہیں کی گئی۔ گویا قومی زندگی کا نہایت ہی اہم معاملہ سرے سے کوئی اہم معاملہ نہیں ہے، بلکہ ایک مذاق ہے۔ یہ مذاق بیس سال سے ایک عنصر جاری رکھے ہوئے ہے۔ کبھی وہ دب جاتا ہے اور اس کی لے بالکل دھیمی پڑ جاتی ہے، اور کبھی وہ یکایک سر ابھارتا ہے اور زیادہ زور سے نعرہ لگا دیتا ہے۔ لیکن اہلِ پاکستان اپنے دین اور اپنی مملکت کی طے شدہ دستوری بنیادوں کے خلاف روز روز کے اس مذاق کے روادار نہیں ہو سکتے۔

دو ٹوک بات سیدھی سیدھی دو ٹوک بات یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام اور سوشلزم دو برابر کے مدّعی نہیں ہیں۔ یہ دونوں مساوی بنیاد پر ایک دوسرے کے مدمقابل قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ صحیح پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ملک نہ اسلام کا تھا نہ سوشلزم کا، اور قوم کو اب یہ فیصلہ کرنا ہو کہ وہ اسلام چاہتی ہے یا سوشلزم، اور اس معاملہ میں دونوں کا دعویٰ مساوی حیثیت رکھتا ہو۔ بلکہ صحیح پوزیشن یہ ہے کہ ملک اسلام کا ہے، اسی کے نام پر بنا ہے۔ اسی کی خاطر ہندو اور انگریز سے لڑ کر یہ الگ ملک بنایا گیا ہے، اور اب سوشلزم یہ دعویٰ لے کر سامنے آیا ہے کہ اس ملک کو اسلامی مملکت کے بجائے سوشلسٹ ملک بنایا جائے۔ معاملے کی اس نوعیت کو پروپیگنڈا کی دھول اڑا کر دھندلانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اسے اس شکل میں پیش کیا جا رہا ہے کہ گویا پاکستانی قوم کو اب اسلام اور سوشلزم میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔

تشکیل پاکستان کی وجہ کیا تھی ایسا بے جا سوال اٹھا کر جو لوگ مملکت کی اصولی بنیادوں پر بار بار ضربیں لگا رہے ہیں، وہ درحقیقت تاریخ کو جھٹلا رہے ہیں۔ پاکستان ہرگز اس بنیاد پر نہیں بنا تھا کہ ہندوستان سے علیحدگی چاہنے

والے مسلمان سوشلزم قائم کرنا چاہتے تھے، اور بھارت کا ہندو اس میں مزاحم تھا۔ نہ ہندو مسلم کشمکش کی ساری تاریخ اس محور پر گھوم رہی تھی کہ مسلمانوں کا نصب العین سوشلسٹ نظام کا قیام تھا اور ہندو کو سوشلسٹ نظام سے سخت عناد تھا، اس لیے مجبوراً علیحدگی کا فیصلہ کرنا پڑا۔

سارا جھگڑا تو اسلام کی بنیاد پر ہوا تھا۔ مسلمان اسلامی نظامِ حیات اور اسلامی تہذیب کو نشوونما دینا چاہتے تھے، اور بھارت کے ہندو انہیں اس کا موقع دینے کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ ان کے منصوبے یہ تھے کہ مسلمانوں کے رہے سہے جداگانہ مذہبی و تہذیبی وجود کو ختم کر کے انہیں متحدہ قومیت کا جزوِ بدن بنا لیں۔

کشمکش اور قربانی کس کے نام پر؟ یہ وہ کشمکش تھی جس کے نتیجے میں پاکستان بنا، اور اس کی بھاری قیمت مسلم عوام نے خدا و رسول اور ان کے دین کی خاطر اپنی لاکھوں لاشوں اور بے شمار عصمتوں اور گراں بہا جائدادوں کی شکل میں ادا کی۔ کیا آج سوشلزم کا کوئی علمبردار یہ بتا سکتا ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے شہداء اور مصیبت زدگان میں کتنے تھے جنہوں نے اپنے خدا اور دین کے لیے نہیں بلکہ سوشلزم کی خاطر قربانیاں دی تھیں؟ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ پکار کر طرح طرح کی آفات کو لبیک کہنے والوں میں، یا ان کے مقابلے میں کتنے فیصدی تھے وہ لوگ جنہوں نے اپنے اس نعرے پر جان اور مال اور عصمت اور ناموس کی قربانیاں دی ہوں کہ پاکستان کا مطلب کیا ـــ سوشلزم؟ کیا ایسے لوگ ایک فی ہزار، بلکہ ایک فی لاکھ بھی تاریخ کے ریکارڈ میں سے نکال کے سامنے لائے جا سکتے ہیں؟ کوئی ایک موت بھی ایسی ہے جو تحریک پاکستان میں سوشلزم کے نام پر ہوئی ہو، اور مرنے والے نے کلمہ طیبہ پڑھنے کی جگہ اس اعلان پر دم توڑا ہو کہ میں سوشلزم کی خاطر مر رہا ہوں، یا ایسے پاکستان کی خاطر جان دے رہا ہوں جس کا مقصد سوشلسٹ نظام کا قیام ہے؟

مشکلات سے فائدہ اٹھا کر ایک قوم کی قوم اپنے سے بڑی قوم سے سیاسی لڑائی لڑ کر اور بے اندازہ قربانیاں اس مقصد کے لیے دے کر بڑے ارمانوں کے ساتھ ایک مملکت کی تشکیل کرتی ہے کہ اس میں اس کا اپنا نظریۂ حیات جلوہ آرا ہو گا اور آزادی پانے کے بعد وہ اس میں اپنے عقیدے کے مطابق نظامِ زندگی کی تعمیر کسی رکاوٹ کے بغیر کر سکے گی۔ لیکن اسی قوم کے اندر سے ایک عنصر ایک دوسرا نظریۂ حیات لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے جس کے کسی ایک فرد کا بھی اس ساری لڑائی میں بحیثیت علمبردارِ اشتراکیت کوئی حصہ نہ تھا۔ یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ آخر اس کی وجہ اس کے

سوا اور کیا ہے کہ اس قوم کو سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں مبتلا پا کر کچھ لوگ اس کی مخلصانہ مدد کرنے کے بجائے الٹا اس کی مشکلات سے فائدہ اٹھا کر اس کے محبوب نصب العین کی جڑیں کھودنا چاہتے ہیں، وہ اس سے اس کا دین چھین لینا چاہتے ہیں۔ وہ اس سے اس کے صدیوں کے خواب اور ارمان لوٹ لینا چاہتے ہیں۔ وہ اس کے گھر پر اپنی کا قبضہ جمانے کے لیے پروپیگنڈا کی مہم اٹھاتے ہیں۔

کانگریس والی چال اس وقت ہمارے ہاں ایک گروہ ایسا ہے جس میں کچھ لوگ دانستہ سازش کے تحت اور کچھ لوگ سادہ لوحی کے تحت یہ صدا بلند کرتے ہیں کہ:

"اس وقت جبکہ آمریت کے خلاف جدوجہد کی جا رہی ہے، اس جھگڑے کو پیچھے ڈال دینا چاہیے کہ یہاں اسلامی نظام چلے گا یا سوشلسٹ نظام؟ پہلے آمریت کو ہٹا کر جمہوریت قائم کر لی جائے، پھر قوم سے یہ سوال طے کرایا جا سکتا ہے کہ وہ دونوں میں سے کس نظام کو پسند کرتی ہے۔"

یہ نصیحت بالکل اسی طرح کی ہے جس طرح آزادی سے پہلے کانگریسی نیشنلسٹ حلقے مسلمانوں کو بہلا پھسلا کر اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ پہلے ہندو مسلم امتیاز کو درکنار رکھ کر انگریز کے خلاف لڑائی لڑی جائے، پھر جب آزادی مل جائے گی تو اس وقت اسلام کے متعلق طے کرتے رہیں گے کہ مستقبل میں مسلمانوں کو اپنے دین کے نشوونما کے لیے کیا امکانات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس خوبصورت اور مغالطہ انگیز پروپیگنڈے سے کانگریسی ہندوؤں کا منشا یہ تھا کہ ایک طرف وہ اپنی مضبوط سیاسی و اقتصادی پوزیشن کو مضبوط تر کرتے جائیں اور اپنے بظاہر سیکولر اور بباطن برہمن ازم کے رجحانات کی جڑیں گہری کرتے جائیں اور دوسری طرف بھولا بھالا مسلمان پورے اخلاص و ایثار کے ساتھ انگریز کے خلاف متحدہ لڑائی لڑتا رہے۔ مسلمان عوام کی اکثریت نے اپنے ذی شعور دینی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں کی رہنمائی میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے اس کانگریسی فریب کو رد کر دیا، کیونکہ ان پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ آزادی ملنے کے بعد متحدہ قومیت کے پردے میں جب ایک بار ہندو اکثریت ملک پر پورا تسلط جما لے گی تو پھر اسلام کے لیے ان سے لڑائی لڑنے کی گنجائش کہاں رہے گی؟ چنانچہ اب دیکھ لیجیے کہ آزادی ملنے کے بعد سے اب تک ہندوستان میں عام مسلمانوں پر تو جو کچھ گزری سو گزری۔ کٹر سے کٹر کانگریسی اور نیشنلسٹ رہنما تک وہاں کیا کچھ بھگت رہے ہیں۔ آزادی کے لیے غیر مشروط اتحاد کے علمبردار علماء اسلام کی لڑائی لڑنے کے لیے کیا وہاں کوئی ادنیٰ سا راستہ بھی پا رہے ہیں؟

آمریت دشمنی کی آڑ میں | ٹھیک وہی بات آج ہم سے یہاں کہی جارہی ہے اور وہی چال یہاں بھی چلی جارہی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم عام مسلمان اور ہمارے علماء حضرات تو سوشلزم سے دوستی گانٹھ کر آمریت سے لڑنے میں مصروف ہو جائیں اور سوشلزم کے علمبردار آمریت سے لڑائی کے ساتھ ساتھ اپنی تنظیماتی بنیادوں کو بھی مضبوط کرتے چلے جائیں اور اپنے پروپیگنڈے کا طوفان اتنے زور سے اٹھاتے رہیں کہ جب آمریت سے نجات کا وقت آئے تو پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ کے بجائے سوشلزم بن کر رہ جائے۔ اس کے بعد اگر مسلمان اسلام کا سوال اٹھائیں تو ان کو جواب ملے کہ مذہب تو افیون ہے، اور جو لوگ مذہب کا نام لیتے ہیں وہ سامراجیوں اور سرمایہ داروں کے پٹھو ہونے کی وجہ سے گردن زدنی ہیں۔

سوشلسٹ عنصر کی چال | اس وقت پاکستان کا سوشلسٹ عنصر آگے بڑھنے کے لیے سخت بیقرار ہے، کیونکہ ایک طرف اسے اپنے مقصد کے لیے اضطراب زدہ عوام اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے شکاری کے سامنے وافر شکار آجاتا ہے، اور دوسری طرف انہیں ایسی تنظیم بین الاقوامی طاقتوں کی سرپرستی حاصل ہے جن کی سرحدیں عین ہماری سرحدوں سے متصل واقع ہیں۔ ان دو وجوہ سے وہ اپنے لیے موجودہ موقع کو بہترین موقع سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کی مشکل یہ ہے کہ وہ اپنی قلیل سی تعداد کے ساتھ جب بھی اپنی الگ حیثیت میں ملک کے عوام کے سامنے آنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی بات بنتی نہیں۔ ان حالات میں ان کی تمام تر کوشش یہ ہے کہ ان کو کسی نہ کسی سیاسی و مذہبی عنصر کی پناہ مل جائے جس میں گھل مل کر وہ براہِ راست عوام کی صفوں میں اپنا راستہ بنا سکیں۔ اس غرض کے لیے وہ جمہوریت پسند سیاسی جماعتوں میں بھی گھس رہے ہیں اور ایک خاص مذہبی گروہ کو بھی اپنا آلۂ کار بنا رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا جاسکے کہ اسلام اور سوشلزم میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن جن دینی و سیاسی جماعتوں کو انہوں نے تاکا ہے، وہ اگر بصیرت مند ہوں تو وہ ان کو اپنا کندھا پیش کریں گی، اور نہ انہیں سوشلزم کے پروپیگنڈے کی بندوق چلانے کا موقع دیں گی۔ البتہ اگر انہوں نے کمزوری یا بھولپن کا ثبوت دیا تو یہ تیز طرار اور جارحیت مزاج گروہ ان کے کندھوں پر صرف اپنی بندوق ہی نہیں رکھے گا بلکہ ان پر سوار ہو جائے گا۔

یہ ہے وہ منصوبہ جس کے تحت آج ہم سے کہا جا رہا ہے کہ آمریت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اسلام کا سوال بیچ میں نہ لایا جائے، اور پھر بیچ کے کچھ بھولے بھالے دانشور بھی بول اُٹھتے ہیں کہ ہاں بھائی بات

تو ٹھیک ہے، فی الحال اسلام اور سوشلزم دونوں کو الگ رکھ دیا جائے۔ بس آمریت کے خلاف متحدہ محاذ بن جانا چاہیے۔ مگر یہ منطق بالکل غلط ہے!

دونوں کی پوزیشن ایک سی نہیں ہے | آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام اور سوشلزم دونوں کو ایک سطح پر لا کر یہاں برابر کی حیثیت دے دی جائے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ پاکستان اسلام کا ملک ہے اور سوشلزم ایک نئے مدعی کی حیثیت سے اٹھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ ملک میرا ہے یا میرا ہونا چاہیے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک مکان کا مالک ہو، اور ہمیشہ سے اس کی ملکیت مسلّم چلی آ رہی ہو، اور ایک دن اچانک وہ دیکھے کہ اس کے مکان کا ایک نیا دعوے دار سامنے آگیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مکان میرا ہے، آپ یہاں سے تشریف لے جائیے۔

ایسی صورت میں جو لوگ اسلام اور سوشلزم دونوں کو ایک سطح پر رکھ کر یہ کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ آگے چل کر اس ملک کے باشندوں کو کرنا ہوگا کہ آیا پاکستان کو اپنی اصل اسلامی بنیاد پر چلنا ہے یا اشتراکیت کے پیچھے جانا ہے، وہ نہایت غیر معقول بات کہتے ہیں۔ ان کی یہ بات اتنی ہی نامعقول ہے جتنی اصل مالک مکان اور ایک جعلی دعویدار کو برابر کا درجہ دینے کی بات نامعقول ہے۔ دراصل پاکستان کے مسلمانوں کو فیصلہ یہ نہیں کرنا ہے کہ یہاں اشتراکیت چلے گی یا اسلام، بلکہ فیصلہ یہ کرنا ہے کہ جس ملک کو انہوں نے لڑ بھڑ کر اسلام کے لیے حاصل کیا ہے اس میں وہ اشتراکیت کے علمبرداروں کو برداشت بھی کریں یا نہیں۔

نئے جعلی دعوے دار کی مزاحمت | علیٰ ہذا القیاس جو لوگ یہاں اسلام کے مقابلے میں سوشلزم کے دعوے کی مزاحمت کر رہے ہیں ان کی صحیح پوزیشن کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ان کی پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک دعویٰ ان کا ہے، اور ایک دعویٰ ان کے مقابل کا۔ درحقیقت وہ ایسی حالت میں ایک ناجائز و غیر مستحق دعوے دار، یا صحیح الفاظ میں جھوٹے مدعی کا مقابلہ کر رہے ہیں جبکہ وہ مدعی شور مچا مچا کر، اپنے حمایتیوں سے نعرے لگوا لگوا کر، اور اصل مالک کے ساتھیوں جیسے سادہ لوح لوگوں کو فریب دے دے کر آہستہ آہستہ مکان پر قبضہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

کوئی معقول آدمی ان دونوں کو ایک درجے میں رکھ کر یہ نصیحت نہیں کر سکتا کہ دیکھو بھئی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر فی الحال جھگڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس وقت جو شخص یہ نصیحت کرتا ہے وہ ملک و قوم کے مسلّمہ نظریۂ حیات کے مقابلے میں دانستہ یا نادانستہ ایک جعلی دعوے دار کی مدد کرتا ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ آمریت کے خلاف بحالی جمہوریت

کی جد وجہد کرنے کے لیے سوشلسٹ حضرات آنا چاہیں تو خوشی سے آئیں، مگر اپنے ناجائز کلیم (CLAIM) کو بالائے طاق رکھ کر آئیں۔ ورنہ مسلمانوں کو اول قدم ہی پر انہیں یہ صاف صاف بتا دینا ہوگا کہ وہ سوشلزم کے لیے ان کے دعوے کو بالکل ناجائز سمجھتے ہیں اور بحالی جمہوریت کی جد وجہد میں ان کے تعاون کی یہ قیمت ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ ان کے اس کاروبار کو یہاں چلنے دیں۔

سوشلزم کے مختلف ترجمان | پاکستان کا اسلامی تصور رکھنے والے عوام جب یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہاں سوشلزم کا ترجمان آخر ہے کون اور اس کا دعویٰ کیا ہے تو انہیں ایک ترجمان سے نہیں بلکہ مختلف ترجمانوں سے سابقہ پیش آتا ہے، اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی الگ بولیاں بولتا ہے۔

ان میں اگر اتفاق ہے تو صرف اس ایک مقصد پر کہ پاکستان کی طے شدہ اسلامی بنیادوں کو متزلزل کر دیا جائے ان میں سے دو گروہ تو ایسے ہیں جو خالص سوشلسٹ نظام چاہتے ہیں اور اسلام کا نام تک نہیں لیتے، بلکہ ان میں سے ایک کے ایک مشہور رہنما نے تو صاف صاف کہہ بھی دیا ہے کہ بحالی جمہوریت کے بعد قوم فیصلہ کرے گی کہ وہ اسلام چاہتی ہے یا سوشلزم۔

لیکن ان کے درمیان یہ اختلاف اب معلوم عوام ہو چکا ہے کہ ایک کا رُخ چین کی طرف ہے اور دوسرے کا رُخ ماسکو کی طرف۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر خدانخواستہ قوم نے سوشلزم کی راہ اختیار کی بھی تو اسے ایک راستہ نہیں ملے گا بلکہ ایک دوراہا اس کے سامنے آئے گا اور اسے پھر اس سوال سے دوچار ہونا پڑے گا کہ پیکنگ کی طرف جائے یا ماسکو کی طرف۔

اس کے بعد سوشلزم کی علمبردار ایک اور پارٹی ہمارے سامنے آتی ہے جس نے یہ نعرہ بلند کیا ہے کہ:

"ہمارا مذہب اسلام۔ ہمارا معاشی پروگرام سوشلزم۔ ہمارا سیاسی نظام جمہوریت"

یہ ایک نئی تثلیث ہے جس کا سرسری طور پر تجزیہ کیجیے تو حسبِ ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

(۱) اسلام صرف ایک مذہب ہے جو سیاست اور معیشت میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتا۔ وہ صرف نماز روزے کی حد تک ہمارا مذہب ہے۔

(۲) معیشت کے معاملے میں رہنمائی کے لیے ہم کو لازماً مارکس اور لینن کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اس کے بعد کچھ

معلوم نہیں کہ ہم چین کی پیروی کریں گے یا روس کی، یا مارشل ٹیٹو کی یا کسی اور کی۔

(۳) سیاسی نظام بھی ہم بہرحال اسلام سے نہیں بلکہ کسی اور جمہوریت سے لیں گے۔ مگر یہ بات ابھی واضح نہیں کی گئی ہے کہ وہ جمہوریت برطانیہ والی ہوگی، یا امریکہ والی، یا روس والی، یا چین والی، یا کیوبا والی، یا یوگوسلاویہ والی، یا چیکوسلاویکیہ والی ـــــ یہ معاملہ گول کر دیا گیا ہے تاکہ جمہوریت کے نام پر لڑائی لڑنے کے بعد اگر اقتدار مل جائے تو یہ سیاسی نظام اپنی مرضی کا گھڑا کر کے اس پر جمہوریت کا سائن بورڈ لگا دیا جائے (حالانکہ یہ سائن بورڈ تو اب بھی موجود ہے)۔

(۴) اسلام چونکہ محض ایک مذہب ہے جس کا تعلق زندگی کے اجتماعی معاملات سے کچھ نہیں ہے، لہٰذا اسے میدان سے الگ ہو کر مسجدوں اور حجروں میں دم سادھ کے بیٹھ رہنا چاہیے ـــــ تا آنکہ مستقبل کا انقلابی نظام مسجدوں و حجروں سمیت اس کی قسمت کا آخری فیصلہ کر دے۔

اس فارمولے میں اسلام کو وہی جگہ دی جا رہی ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ ـ

ملا کو جو مسجد میں ہے سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلامی سوشلزم ان نعروں کے ساتھ ایک آواز یہاں "اسلامی سوشلزم" کی بھی سنائی دیتی ہے جو کرسچین سوشلزم کے مماثل ایک ترکیب ہے۔ کرسچین سوشلزم کے تجربات آخرکار نیشنل سوشلزم پر منتج ہو کے رہے جس نے اپنے جوہر کرشمے نازی جرمنی میں دکھائے تھے۔ عیسائیت تو کسی خلائی جہاز کو فضا میں دھکا دینے والے راکٹ کی طرح راستے ہی میں الگ ہو کر گم ہو گئی، اور نیشنل سوشلزم کے خلائی جہاز کو زیادہ تیز رفتار حاصل ہو گئی۔

اب تک یہ بات قطعی طور پر واضح نہیں کی گئی ہے کہ سوشلزم کے ساتھ "اسلامی" کا لفظ شامل کرنے کا آخر مطلب کیا ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اسلام اور سوشلزم کا مرکب ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس میں کون سے نکات ایک طرف کے اور کون سے دوسری طرف کے ہوں گے؟ اس کے اندر اسلام کتنے فی صدی ہوگا اور سوشلزم کتنے فی صدی؟ اور اسلام نے کب کسی مسلمان کو اس کا مجاز کیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ جو چیز چاہے ملا کر ایک مرکب تیار کرلے اور اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصد تو وہی سوشلزم لانا ہے جسے دنیا اس معروف نام سے جانتی ہے، جس کی مختلف شکلیں اس وقت روس، چین، مشرقی یورپ، کیوبا وغیرہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں عملاً رائج ہیں، لیکن

اسلامی کا لفظ اس کے ساتھ صرف اس لیے لگایا گیا ہے کہ یہ پاکستان کے مسلمانوں کے لیے آسانی سے قابلِ قبول بن جائے، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ ایک فریب ہے جو یہاں کے مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے، اور اس فریب کا پردہ جتنی جلدی چاک کر دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

اور اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اسلام کا سوشلزم، یا وہ سوشلزم ہے جو اسلام میں پایا جاتا ہے، تو جو شخص بھی یہ نام لے کر پبلک کے سامنے آئے اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ جس چیز کو بھی وہ اسلام کا سوشلزم کہتا ہے اس کا ثبوت قرآن و سنت سے پیش کرے، کیونکہ کوئی چیز بھی اُس وقت تک اسلامی نہیں کہی جا سکتی جب تک دلائل سے اس کے ماخذ کی نشان دہی قرآن و سنّت میں نہ کر دی جائے۔ دلائل کے معنی احکام اور اصطلاحات پر ادیبانہ حاشیہ آرائی اور شاعرانہ نکتہ آفرینی کرنا نہیں ہے۔ اسلام کی اساسی حکمت کو حکمت ہی کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے۔ اس کے قوانین کو قوانین ہی کی حیثیت دینی چاہیے اور اس کی اخلاقی ہدایات کو اخلاقی ہدایات ہی کے درجے میں رکھنا چاہیے۔ ان ساری چیزوں کو خلط ملط کر کے ایک جبری قانون اور ایک من مانا ضابطہ نہ بنا ڈالنا چاہیے۔

مزید براں یہ بات بھی خوب سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص بھی کسی چیز کو اسلام کا سوشلزم قرار دے اس کے پیش کردہ "اسلامی سوشلزم" کو اس وقت تک ملکی نظام نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ اس ملک کے مسلمانوں کی اکثریت یہ تسلیم نہ کر لے کہ ہاں واقعی یہ سوشلزم قرآن و سنت سے نکلتا ہے، اور قرآن و سنت کا منشا اسی کو قائم کرنا ہے۔ لہٰذا جو اصحاب اس معنی میں یہ لفظ استعمال کرتے ہوں ان کو صاف صاف یہ اقرار کرنا چاہیے کہ وہ یہاں وہ سوشلزم لانا چاہتے ہیں جو قرآن و سُنّت سے نکلتا ہو اور جسے یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت تسلیم کرے کہ یہ سوشلزم قرآن و سنّت سے ثابت ہے۔

کچھ لوگ یہ بھی کہتے سُنے گئے ہیں کہ اسلامی سوشلزم سے مراد اسلام کا عدلِ اجتماعی (SOCIAL JUSTICE) ہے لیکن اگر اس سے مراد یہی ہو تو وہ بہر حال اسلام ہی ہے۔ اس کے لیے سوشلزم کا لفظ استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے، خصوصاً جبکہ سوشلزم ایک معروف نظامِ زندگی کا نام ہے جو صرف کاغذ پر لکھا ہُوا ہی نہیں ہے بلکہ دنیا میں بہت سے ملک اس نظام پر چل رہے ہیں۔

اسلامی سوشلزم کے دو خواص | اسلامی سوشلزم کے مذکورہ بالا چار ممکن مفہومات کے سوا اس کا کوئی اور مفہوم بھی ہم

تو اسے ہم نہیں جانتے۔ آج تک یہ نعرہ مفہوم و مدعا کی تعیین کے بغیر بالکل مبہم طریقے سے لگایا جاتا رہا ہے، اور جہاں بھی یہ نعرہ بلند ہوا ہے وہاں اس کے اندر دو خواص لازماً پائے گئے ہیں جن سے اس تحریک کی ماہیت اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے۔

ایک یہ کہ "اسلامی سوشلزم" کے نام سے قائم شدہ محاذ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک اور انڈونیشیا میں اپنا یہ تجربہ پیش کر چکا ہے، اور اب پاکستان میں یہ رنگ دکھا رہا ہے کہ اس کی فکری اور سیاسی دونوں طرح کی لڑائی کا سارا زور "خالص اسلامی نظام" چاہنے والوں کے خلاف صرف ہوتا ہے۔ اور اس کا سارا تعاون اور بھائی چارہ ان لوگوں کے لیے مخصوص رہتا ہے جو کھلے کھلے مارکسزم کے حامی ہوتے ہیں اور اسلام کا نام تک نہیں لیتے۔

دوسرے یہ کہ "اسلامی سوشلزم" سے شروع ہو کر بات آخر کار "مکمل اور خالص سوشلزم" پر جا کر ختم ہوتی ہے یہی صورت ان تمام مسلمان ممالک میں پیش آئی ہے جہاں "اسلامی سوشلزم" سے آغازِ کار لیا گیا۔ اور اب یہاں پاکستان میں بھی اسی صورتِ حال کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ اس کی واضح دلیل مسٹر بھٹو کا وہ تازہ انٹرویو ہے جو نوائے وقت مؤرخہ ۱۶ جنوری ۱۹۶۸ء میں ہفت روزہ "نصرت" کے حوالہ سے شائع ہوا ہے۔ مسٹر بھٹو پہلے "اسلام ہمارا مذہب، سوشلزم ہمارا معاشی پروگرام اور جمہوریت ہمارا سیاسی پروگرام" کا نعرہ لے کر اٹھے تھے۔ پھر انہوں نے "اسلامی سوشلزم" کا نعرہ بلند کرنے والے دانشوروں اور صحافیوں سے رشتہ جوڑا۔ اور اب وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ میں سوشلسٹ ہوں، سوشلسٹ معاشرے کا قیام چاہتا ہوں، اور میں نے اپنی مستقل پارٹی اس لیے بنائی ہے کہ بائیں بازو (اصحاب الشمال!) کے عناصر منتشر ہو چکے تھے اور انہیں مجتمع کر کے باعمل بنائے بغیر سوشلسٹ معاشرہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اب ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لے کر خالص سوشلزم کے علمبرداروں کی ہمت افزائی کر رہے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ کس قسم کا خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔

<u>اس کے نتائج کیا ہوں گے!</u> پاکستان کو سوشلزم کی راہ پر ڈالنے والے سُرخ علمبرداروں کا معاملہ تو الگ نوعیت کا ہے، کیونکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں سوچ سمجھ کر کر رہے ہیں۔ مگر ان کے نعروں سے متاثر ہونے والے حضرات سے ہم یہ گزارش کرتے ہیں کہ براہِ کرم آنکھیں بند کر کے سیلاب میں بہنے سے پہلے اُن نتائج پر بھی ایک مرتبہ غور کر لیں جو پاکستان کو سوشلسٹ کیمپ میں دھکیلنے سے برآمد ہوں گے۔

(۱) سوشلزم کے ساتھ جمہوریت نہیں چل سکتی، ٹھیک اُسی طرح جیسے جمہوریت کی کُھلی فضا میں سوشلزم نہیں چل سکتا۔ سوشلزم صرف ایک جابرانہ آمریت ہی کے ذریعہ سے چل سکتا ہے، اور اگر وہ ایک دفعہ جمہوریت کے ذریعہ سے لے بھی آیا جائے تو آخر کار جمہوریت ختم اور آمریت قائم ہو جاتی ہے۔ یہ محض ایک خیالی اندیشہ نہیں ہے۔ دنیا میں جہاں بھی سوشلسٹ نظام قائم ہوا ہے اور جہاں وہ اب چل رہا ہے، ایسے سب ملکوں کی تاریخ اور ان کے حالات پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

(۲) سوشلزم اختیار کرنے والے ہر ملک کے لیے، اور خصوصاً ایک کمزور ملک کے لیے ناگزیر ہے کہ اسے سوشلسٹ ممالک کے دائرۂ اثر میں جانا پڑے گا۔ اس سُرخ مدار (ORBIT) میں داخل ہونا تو آسان ہے مگر اس سے نکلنے کے راستے بند ہیں۔ اس کے نتائج کا اندازہ کرنے کے لیے چیکوسلوواکیا کے انجام کو دیکھ لیجیے جہاں ایک کھلے بین الاقوامی اسٹیج پر ایک سبق آموز کھیل دکھایا جا چکا ہے۔

(۳) مختلف سوشلسٹ انقلابوں کی تاریخ اور سوشلسٹ ملکوں کے حالات کا مطالعہ آپ پر یہ راز بھی فاش کر دے گا کہ اِس پھندے میں حسین امیدوں کے ساتھ اپنی گردن پھنسا دینا تو آسان ہے، لیکن جب یہ پھندا کسی ملک کی آبادی کے گلے میں پڑ جاتا ہے تو وہ سوشلسٹ نظام کی گرفت میں اس قدر بے بس ہو جاتی ہے کہ پھر اگر اس سے آزاد ہونا چاہے تو کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس میں کوئی حزبِ اختلاف نہیں ہوتی۔ کوئی آزاد پلیٹ فارم نہیں ہوتا۔ کوئی آزاد پریس نہیں ہوتا۔ کسی جماعت کے بنانے کا کیا سوال، کوئی شخص اپنی انفرادی حیثیت میں بھی اختلاف کا ایک لفظ اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکتا۔ بدتر سے بدتر سامراج میں بھی تغیر و انقلاب اور تحریک آزادی کی کچھ نہ کچھ گنجائش ہمیشہ باقی رہی ہے مگر سوشلسٹ نظام نے ایسی ہر گنجائش کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ہم پیسٹرنیک اور سویتلانہ کا حوالہ دینا نہیں چاہتے۔ البتہ ان رُوسی نوجوانوں کا ذکر ضرور کریں گے جنہوں نے سُرخ چوک میں چیکوسلوواکیہ کے ساتھ کے خلاف ہلکی سی احتجاجی آواز اٹھا کر اپنے آپ کو اذیتوں کے حوالے کر دیا۔ اور اس سے زیادہ عبرتناک مثال لیوشاؤچی کی ہے جس پر ایک مدت سے لعنت، ملامت اور الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی ہے مگر آج تک اسے کسی پلیٹ فارم یا پریس کے ذریعہ سے اپنی پوزیشن صاف کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ کیا پاکستان کی موجودہ آمریت سے نجات پانے کے لیے ہم اس سے ہزار گنی زیادہ سخت آمریت اپنے اوپر مسلط کر لیں؟

اپنا اپنا واضح موقف ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ پاکستان کے باشندے کسی ذہنی الجھن میں مبتلا نہ رہیں بلکہ دن کی روشنی میں کھلی آنکھوں کے ساتھ دو راستوں کا فرق صاف صاف دیکھ کر ایک راستہ اختیار کریں۔

جو لوگ صدقِ دل سے اسلام اور اسلامی نظام کو جمہوری طریقے پر چلانا چاہتے ہوں، وہ یکسوئی سے اپنا موقف طے کر کے اس پر اس طرح قدم جمائیں کہ پھر یہ قدم مختلف مغالطہ انگیز نعروں کے اثر سے متزلزل نہ ہوں۔ وہ سوشلسٹوں کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ آمریت سے لڑائی کے لیے اتحاد کے نام پر یہ تسلیم کرالیں کہ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کا مسئلہ ابھی طے شدہ نہیں بلکہ مختلف فیہ ہے۔ اور یہاں اسلام اور سوشلزم دو برابر کے دعویدار رہیں۔ ایسا مان لینے کے معنی نہ صرف اسلام کو اُس کے اپنے گھر میں کمزور کر دینے کے ہونگے، بلکہ یہ اُن بے شمار شہیدوں کی روح سے بدترین غداری ہو گی جنہوں نے محض "پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ" کا جھنڈا بلند رکھنے کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔

دوسری طرف سوشلزم کو اپنا دین ماننے والے حضرات کو بھی چال بازیاں چھوڑ کر اپنی اصل حیثیت میں لوگوں کے سامنے آنا چاہیے اور کسی لاگ لپیٹ کے بغیر یہ کہنا چاہیے کہ وہ اسلام نہیں چاہتے بلکہ سوشلزم چاہتے ہیں۔

حرفِ آخر سوشلزم کے حامی حضرات اسلام پسند طبقوں پر یہ الزام لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ سامراج کے حامی ہیں اور سرمایہ داری اور جاگیرداری اور تمام معاشی بے انصافیوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ سراسر جھوٹ ہے جس سے عوام کو فریب دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہم علی الاعلان کہتے ہیں کہ:

ہم سفید اور سرخ سامراج، دونوں کے مخالف ہیں، اور پاکستان کو ان میں سے کسی کی گود میں بھی پھینکنا نہیں چاہتے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ پاکستان ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے ہر اس ملک سے دوستی کرے جس سے دوستی اور تعاون انسانیت اور خود پاکستان کی بھلائی کے لیے مفید ہو، مگر کسی کا ضمیمہ بردار بن کر نہ رہے۔

اور ہم معاشی ظلم کی ہر اُس صورت کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جو اس ملک میں برطانوی استعمار کے چھوڑے ہوئے ایک سراسر غیر اسلامی نظامِ معیشت کو برقرار رکھنے کی وجہ سے پائی جاتی ہے۔ لیکن ان بیماریوں کا علاج ہم مارکس اور لینن کے دیئے ہوئے نسخوں سے نہیں کرنا چاہتے بلکہ اللہ اور اس کے رسول نے جو طریقِ علاج ہمیں قرآن اور سنت میں بتایا ہے اس کے مطابق صرف معاشی بیماریوں ہی کا نہیں، بلکہ اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور ہر دوسری بیماری کا علاج بھی ایک ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔

ترکی میں تحریکِ احیائے اسلام کی موجودہ حالت

دورۂ ترکی کے مشاہدات

از جناب خلیل حامدی صاحب

سلجوقیوں اور عثمانیوں کی تاریخ اسلامی تاریخ کا نہایت اہم باب ہے۔ ایشیائے کوچک میں جب سلاجقۂ روم[1] کے بعد عثمانیوں نے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لی تو اسلام کا کاروانِ حق نہ صرف ایشیا اور افریقیہ کے اندر جادہ پیما ہوا بلکہ یورپ کی وادیوں میں بھی اُس نے قدم رکھے اور ویانا کی فصیلوں تک اُس کے جرسوں کی صدا بلند ہوئی۔ راقم الحروف نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (اللہ تعالیٰ آپ کو تا دیر بسلامت رکھے) کی رفاقت میں عربوں کو تو بار ہا دیکھا ہے اور عربوں کی موجودہ تاریخ کا مفصّل مطالعہ کیا ہے، مگر سلاطینِ آلِ عثمان کے گہوارہ کو دیکھنے کا ابھی تک موقع نہ مل سکا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی تاریخ اور تہذیب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کی معاشرتی زندگی کا مشاہدہ کیا جائے اور اُس کے آثار و دیار کو دیکھا جائے۔ عربوں کو چونکہ ہم نے خوب دیکھا ہے اور ہر علاقے کے عربوں کے قومی مزاج اور جُداگانہ اجتماعی رنگ ڈھنگ کا مشاہدہ کیا ہے اِس وجہ سے اُن کی تاریخ اور ان کے مسائل کے بہت سے ایسے گوشے جو محض غائبانہ واقفیت کی بنا پر واضح نہیں ہو سکتے تھے ہمارے لیے اُن کا سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ عثمانیوں[2] اور عربوں کی تاریخ کا دھارا کم از کم ۵ سو سال تک مشترک رُخ پر بہتا رہا ہے۔ سلطان

---

[1] عثمانی سلاطین سے پہلے ایشیائے کوچک پر سلجوقیوں کا ایک خاندان حکمران رہا ہے جو سلاجقۂ روم کہلاتا ہے۔ ان لوگوں کا زمانۂ حکومت سنہ ۱۰۷۷ء سے لے کر سنہ ۱۳۰۰ء تک رہا ہے۔ یعنی پانچویں صدی ہجری کے رُبع آخر سے لے کر ساتویں صدی ہجری کے اختتام تک۔ ان کے بعد عثمانی ترکوں کی باری آئی اور وہ سلاجقہ کے بعد بیسویں صدی عیسوی تک کوسِ حکمرانی بجاتے رہے۔

[2] "ترکوں" کے بجائے "عثمانیوں" کی اصطلاح دانستہ استعمال کر رہا ہوں۔ ترک دوستوں نے مجھے بتایا کہ اس وقت اہلِ دین اور لادین عنصر کے اندر جو کشمکش برپا ہے اُس کی وجہ سے بعض اصطلاحات میں بھی امتیاز پیدا ہو گیا ہے۔ لادین عنصر

سلیم اوّل (۱۵۱۲ء) کے داخلۂ بغداد سے لے کر سلطان عبدالحمید ثانی (۱۹۱۰ء) کی معزولی تک دونوں قوموں کی تاریخ ایک ہی قالب میں ڈھلتی رہی ہے۔ اس لیے عربوں کی تاریخ کا ہمہ پہلو جائزہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک عثمانیوں کی تاریخ، ان کی تہذیب اور ان کے آثار و دیار سے مکمل براہِ راست واقفیت نہ ہو۔ علاوہ بریں ترکی قوم بجائے خود بھی اسلامی دنیا کی ایک نہایت اہم قوم ہے جس کا بناؤ اور بگاڑ پوری دنیا کے مسلمانوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس بنا پر بھی یہ ضروری ہے کہ ہم اس قوم کو قریب سے دیکھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس وقت اس کے اندر کیا رجحانات کارفرما ہیں۔ اسی احساس کے تحت مدت سے یہ خواہش تھی کہ ترکی کا سفر کیا جائے اور عثمانی ترکوں کے مراکز اور تہذیبی باقیات کو دیکھا جائے۔ یہ جذبہ پکتا رہا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے اس سال رمضان المبارک کے اندر اِسے بروئے کار لانے کا موقع فراہم کر دیا۔

سعودی عرب — روانگی: ۱۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو راقم الحروف ایک صحافتی وفد کے ہمراہ، جسے سعودی عرب کی وزارت اطلاعات نے دعوت دی تھی، جدہ روانہ ہوا اور ۱۲ سے ۲۴ نومبر تک اس وفد نے جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، طائف اور ریاض کا دورہ کیا۔ اس سفر میں عمرہ اور زیارت مدینہ منورہ کے ساتھ ساتھ ہم نے بعض سعودی اداروں کو بھی دیکھا۔ اس کے بعد وفد کے دوسرے شرکاء تو پاکستان واپس ہو گئے اور میں چند روز مزید سعودی عرب میں گزارنے کے بعد ۲۸ نومبر ۱۹۶۸ء

م۔ ترک ملت او ترک مفادات کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اہل دین عنصر مسلم ملت یا عثمانی قوم کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ عثمانی کی نسبت بھی دراصل ترکوں کے مورثِ اعلیٰ عثمان کی طرف ہے جو ارطغرل کا بیٹا تھا۔ یہ ارطغرل بھی سلاجقہ کے ابنائے عم میں سے تھا اور ترکانِ غُز (جن کا اصل وطن ماوراء النہر کے اُس پار تھا) کی طرف منسوب تھا۔ اس کا قبیلہ ماوراء النہر سے ہجرت کر کے ایشیائے کوچک کے شمال مغرب میں آباد ہو گیا۔ رومی سلاجقہ نے جو اس وقت یہاں کے حکمران تھے، ارطغرل کی جوانمردی، شجاعت اور جفاکشی کی بنا پر اسے چند علاقے جاگیر میں دے دیئے۔ اور جب سلاجقہ کے اندر ضعف اور زوال کے آثار اُبھرنے لگے تو اُس نے بڑھ کر سلطنت کی زمام سنبھال لی۔ ارطغرل کے بعد اُس کے بیٹے عثمان نے صحیح معنوں میں اس سلطنت کا تشخص قائم کیا۔ چنانچہ یہ سلطنت بعد میں اُسی کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئی۔ عثمان خود بڑا مجاہد اور خدا پرست انسان تھا۔ اُس نے اس سلطنت کی بنیادیں جہاد فی سبیل اللہ اور اشاعتِ اسلام کے اصولوں پر قائم کیں۔ چنانچہ تاریخ نے اُسے غازی عثمان کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہ لقب در حقیقت اُسے اپنے عہد کے شیخ الصوفیہ کی طرف سے اہل اللہ کے ایک بہت بڑے اجتماع میں دیا گیا تھا۔

کو ریاض سے بیروت کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرے اس سفر کی اصل منزل لندن تھا۔ میں مولانا مودودی کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا۔ رابطۂ عالمِ اسلامی کے جنرل سیکرٹری شیخ سُرور الصّبان، امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن (جو شاہ فیصل کے چچا ہیں) اور بعض دوسرے ذمہ دار سعودی دوستوں کی خواہش تھی کہ مولانا محترم اگر ہمت پائیں تو پاکستان واپس جاتے ہوئے حجاز رُکیں اور عمرہ اور زیارت سے مشرف ہوں۔ بلکہ سعودی عرب کی وزارتِ تعلیم کی طرف سے بھی یہ دعوت تھی کہ مولانا محترم ریاض یونیورسٹی میں کم از کم ایک تقریر ضرور کریں۔ وزارتِ تعلیم کے ڈائرکٹر کے الفاظ یہ تھے کہ "الاستاذ یبقوا الکلام لیصرفه فی الریاض" (مولانا محترم گفتگو بچا کر رکھیں تاکہ اُسے ریاض میں صرف کریں)۔ میری ڈیوٹی لگائی گئی کہ مَیں ان حضرات کی خواہش کو مولانا محترم کی خدمت میں پیش کروں۔ چنانچہ اِسی دعوت نامہ کو لے کر مَیں ریاض سے ترکی اور پھر وہاں سے لندن جانا چاہتا تھا مگر کچھ ایسی رُکاوٹیں راستے میں حائل ہو گئیں کہ میں لندن پہنچ کر مولانا محترم کی خدمت میں ان کی روانگی سے قبل یہ دعوت بالمشافہہ پیش نہ کر سکا اور ترکی ہی میرے سفر کی آخری منزل ثابت ہُوا۔

بیروت میں مختصر قیام ۱۵ دسمبر کی رات بیروت میں گزاری۔ سردی سخت تھی مگر خوشگوار۔ مفتی اعظم فلسطین محمد امین الحسینی صاحب نے بیروت میں اپنا مہمان ٹھیرایا۔ مفتی صاحب خود تو بیروت شہر کے ایک کنارے محلہ قرن الشباک میں رہتے ہیں مگر انہوں نے میرے قیام کے لیے خود ہی بیروت کے ہوٹل "لوکاندا امریکا الکبریٰ" کو تجویز کیا۔ میرے پیشِ نظر بیروت کا "العربی" ہوٹل تھا۔ مگر مفتی صاحب نے کہا کہ لوکاندا امریکا زیادہ صاف ستھرا ہے۔ صاف ستھرا سے مراد کمروں اور بستروں کی صفائی نہیں بلکہ اخلاقی صفائی ہے۔ بیروت کے ہوٹل اخلاقی صفائی سے بالعموم محروم ہیں۔ صرف ہوٹل ہی کیا پُورا شہر اخلاقی فساد میں مبتلا ہے۔ مولانا محترم فرمایا کرتے ہیں کہ "بیروت مرحاض البلاد العربیة" (بیروت عرب ممالک کا بیت الخلاء ہے)۔ مولانا محترم کی یہ مثال بالکل برحق ہے۔ ہمارے عرب دوست اِس مثال کو اکثر دُہرایا کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ امامؒ اوزاعیؒ کا یہ شہر جو طبعی جمال اور جغرافیائی حُسن

ٔ امام اوزاعی رحمہ اللہ جو امام اہل الشام کہلاتے تھے بیروت میں مدفون ہیں۔ آپ کی قبر مبارک ساحلِ سمندر پر ہے اور عین اُن مراکز کی بغل میں ہے جہاں مرد و عورت ننگے نہاتے ہیں۔ اس پورے علاقے کا نام امام اوزاعیؒ ہے اور عیاشی اور بدکاری کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ سُن کر بڑا دکھ ہُوا کہ یہ علاقہ امام موصوف کے نام سے منسوب ہے۔

کی نعمت سے مالامال ہے، اخلاقی پستی میں بُری طرح گر چکا ہے۔ بلکہ اُس کی اخلاقی غلاظت کے چھینٹے دور دور تک پہنچ رہے ہیں اور ارد گرد کے تمام عرب ممالک اُن سے ملوث ہو رہے ہیں۔ ترکوں اور عربوں کی نسلی جنگ میں بھی اِس شہر نے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا، اور موجودہ عرب اسرائیل جنگ کی تہ میں بھی بیروت کے مفاسد کا گہرا دخل ہے۔

مفتیٔ اعظم فلسطین عربوں کی چلتی پھرتی تاریخ ہیں۔ مولانا محترم سے موصوف کو انتہائی محبت ہے۔ ہر محفل میں مولانا کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور نوجوانوں کو مولانا کی تصنیفات کے مطالعہ کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ ۶۴ء کی بات ہے کہ خاکسار بیروت میں تھا۔ مفتی صاحب نے خاکسار کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ میرے ساتھ شام کی جماعت اخوان المسلمون کے سربراہ اُستاذ عِصام عطار بھی مدعو تھے۔ مفتی صاحب نے اس موقع پر بتایا کہ مولانا محترم سے پہلی مرتبہ اُن کی ملاقات ۱۹۳۵ء میں حیدر آباد دکن میں ہوئی تھی۔ مفتی صاحب مصر کے نامور لیڈر مرحوم محمد علی علوبہ پاشا کے ہمراہ ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے۔ جب حیدر آباد گئے تو لوگوں نے انہیں بتایا کہ ایک نوجوان جس کا نام ابوالاعلیٰ مودودی ہے بڑے مؤثر اور نرالے انداز میں اسلام کی دعوت پیش کر رہا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب کو مولانا محترم سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور باقاعدہ ایک خصوصی دعوت کے ذریعہ اس ملاقات کا اہتمام ہوا۔ مفتی صاحب اپنی اس پُرانی ملاقات سے بڑے خوش تھے۔ بتانے لگے کہ مولانا کے اندر ایّامِ جوانی میں جس عزیمت اور پختگیٔ کردار کی جھلک دیکھی تھی آج بھی جب اُن کو دیکھتا ہوں تو پختگیٔ کردار اور استقامتِ فکر و نظر کا وہ پیکر نمونہ آنکھوں کے سامنے جھلک جاتا ہے۔ ہمارے ترک دوست صالح اُوزجان نے بتایا کہ مفتی صاحب سے جب کبھی میری ملاقات ہوتی ہے تو وہ مجھے یہی نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ ترکی میں دعوتِ اسلامی کا صحیح خطوط پر کام کرنے کے لیے مولانا مودودی سے تربیت حاصل کرو۔ مفتی صاحب کے سکرٹری خلیل علیا صاحب نے ایک قیمتی قلم میرے سپرد کیا اور کہا کہ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ میری آرزو تھی کہ میں لندن جا کر مولانا محترم کی عیادت کرتا مگر بعض وجوہ کی بنا پر یہ موقع نہ مل سکا۔ میں مفتی صاحب کا سلام بھی مولانا محترم کی خدمت میں پیش کروں اور یہ قلم بھی اُن کی طرف سے مولانا کی خدمت میں ہدیہ کروں۔

آستانۂ خلافت میں | ۱۵ دسمبر ۶۸ء کو ۱۱ بجے SAS کے جہاز سے بیروت سے استنبول روانہ ہوا۔ سوا گھنٹے کی پرواز کے بعد میں استنبول کے ایرپورٹ پر تھا۔ بیروت میں جس انقباض اور الم سے دوچار تھا عجیب بات ہے

کہ استنبول کے ایئر پورٹ پر قدم رکھتے ہی طبیعت میں تبدیلی آگئی۔ اب انقباض کے بجائے انبساط محسوس ہو رہا تھا اور الم مبدل بہ راحت تھا۔ اس بات پر دل انتہائی خوش تھا کہ میرے قدم اُس سرزمین پر ٹِک رہے ہیں جو آٹھ سو سال تک اسلامی سلطنت کا مرکز رہی ہے اور جس کی عظمت و جلال اور شکوہ و ہیبت نے اُسے "آستانہ" کا لقب دے رکھا تھا۔ جسے آج ہم ترکی کہتے ہیں یہ عثمانی خلافت کے دور میں اناضول کہلاتا تھا۔ ہمارے ہاں انگریزی کے اثر سے اس کو اناطولیہ کہا جاتا ہے۔ یہ عثمانی خلافت کے متعدد صوبوں میں سے ایک صوبہ تھا۔ اناضول کے لفظ کو "ترکی" سے بدلنے والے طورانی ترک ہیں جنہوں نے خلافت کو ختم کیا اور نسلی بنیادوں پر لادین ریاست کی بنیاد ڈالی۔ ترکی کے عوام الناس اب بھی اناضول کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ استنبول شہر کے علاوہ ترکی کا تمام علاقہ اناضول ہے۔ استنبول کی سڑکوں پر جگہ جگہ ایسے بورڈ آویزاں ہیں جن پر "اناضولو" لکھا ہے۔ اناضولو ہوٹل، اناضولو بنک۔ میں نے ترک دوستوں سے دریافت کیا کہ کیا "اناضول" کا لفظ ابھی تک زندہ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کو متعدد ایسے لوگ ملیں گے جو اب بھی "ترکی" کے بجائے اناضول پسند کرتے ہیں اور اپنے اس پرانے ورثہ سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

پاکستانیوں سے ترکوں کی محبت | استنبول ایئر پورٹ پر ترک ملازمین نے میرے ساتھ انتہائی محبت و عقیدت کا برتاؤ کیا۔ یہ دیکھتے ہی کہ میں پاکستانی ہوں۔ ہر شخص میری طرف لپکا۔ چونکہ ترکی اور پاکستان کے مابین ویزا کی پابندی اٹھا دی گئی ہے اس لیے جہاز کے تمام مسافروں کے اندر میں واحد شخص تھا جسے "پاسپورٹ کنٹرول" کے سامنے لائن میں کھڑا ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ کنٹرول افسر نے مجھے دیکھتے ہی اشارہ کیا کہ میں بلا جھجک اندر چلا جاؤں۔ اس خصوصی امتیاز پر میرے دوسرے تمام رفقائے جہاز جن میں شامی، لبنانی، مصری، انگریز، اور جرمن تھے مجھے بغور گھورنے لگے۔ غالباً وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کاش ان سے بھی ویزا کا تقاضا نہ ہوتا۔ آر سی ڈی کے ملکوں نے جس طرح ویزا کی پابندیاں ختم کر کے خیر سگالی کے بہترین جذبات کو تقویت پہنچائی ہے کیا اچھا ہو کہ دوسرے مسلمان ممالک بھی اسے اپنے لیے مثال بنائیں۔ کسٹم والوں نے تو اور بھی کمال کر دکھایا۔ شامیوں اور مصریوں کے سامان کی چیکنگ اس قدر شدید ہوئی کہ ایک ایک چیز کی تلاشی لی گئی۔ بکسوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا گیا۔ عورتوں کے ہاتھوں میں جو پرس تھے اُن تک کو کھولا گیا۔ مگر مجھ پاکستانی کو یہ فخر حاصل ہے کہ نہ صرف میرا سامان نہیں کھولا گیا، بلکہ قلیوں تک نے محبت سے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور موٹر تک میرا سامان منتقل کرنے پر مجھ سے ایک ترکی لیرا تک لینا گوارا نہ کیا۔ کسٹم کا ایک افسر کچھ نہ کچھ

عوامی عربی (دارجہ) جانتا تھا۔ غالباً ماردین کے علاقے کا ہوگا۔ مجھ سے عربوں کے روایتی انداز میں کہنے لگا: عساک ما تعبت فی الطائرۃ (امید ہے آپ کو جہاز میں کوئی تکلیف نہ ہوئی ہوگی)۔ میں نے کہا الحمد للہ سفر آرام دہ گزرا۔ کہنے لگا "پاکستان میں اسلام بہت ہے"۔ میں نے کہا پاکستان بنا ہی اسلام کے لیے ہے۔ اِس پر وہ اپنے کندھوں کو ہلا کر کہنے لگا کہ میں نے پاکستان کا بڑا شیخ دیکھا ہے۔ وہ یہاں سے گزرا تھا اور اُس نے نماز پڑھائی تھی۔ خاکسار نے عرض کیا کہ میں اُسی شیخ کا شاگرد اور سکرٹری ہوں۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ میرا سامان موٹر میں رکھ دیا گیا، ورنہ دل چاہتا تھا کہ اُس سے مزید باتیں ہوں۔ وہ بھی اپنے کام سے بے نیاز ہو کر مزید تبادلۂ خیال کرنا چاہتا تھا مگر اتنی سی گفتگو پر اکتفا کرنی پڑی۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ مولانا محترم نے لندن جاتے وقت استنبول کے ہوائی اڈے پر جو نماز پڑھائی تھی ہوائی اڈے کے ملازمین پر اُس کے اچھے اثرات پڑے ہیں۔ استنبول کے دوستوں نے بھی مجھے بتایا کہ ہوائی اڈہ پر اِس انداز میں پہلے کبھی باجماعت نماز نہیں ادا کی گئی۔ اِس نماز کا نہ صرف ایرپورٹ پر چرچا ہوا بلکہ کئی روز تک یہ واقعہ عوامی حلقوں میں نقلِ محفل بنا رہا۔ ترکی کے اسلامی اخبار اتحاد نے مولانا کے استقبال کی مفصّل خبر شائع کر دی، اور ساتھ ہی مولانا محترم کی ایک ایسی تصویر چھاپ دی جس میں مولانا محترم نماز کے بعد بیٹھے ہوئے دُعا مانگ رہے ہیں۔ اتحاد کی اِس رپورٹنگ نے ترکی بھر میں اِس خبر کو پھیلا دیا اور اہلِ دین کے لیے خوشی کا سامان فراہم کر دیا۔ اتحاد استنبول سے نکلتا ہے اور ۶۰ ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے۔

استنبول میں پہلی رات میں استنبول یکایک پہنچ گیا تھا۔ استنبول یا انقرہ کے کسی دوست کو اپنی آمد کی پیشگی اطلاع نہ دے سکا تھا۔ استنبول کے محلّہ بایزید میں عمر ہوٹل کے اندر میں نے قیام کر لیا۔ یہ ہوٹل استنبول یونیورسٹی کے عقبی دروازے کے سامنے ہے۔ پہلا دن زبان کی اجنبیت کی وجہ سے تنہائی کی حالت میں گزرا۔ روزنامہ تکمن کے ایڈیٹر محمد شوکت صاحب کو ہوٹل سے دو تین مرتبہ فون کیا مگر وہ نہ مل سکے۔ رات کو نماز تراویح کے لیے قریب کی جامع مسجد میں گیا۔ یہ مسجد سلطان بایزید کے نام سے موسوم ہے اور استنبول یونیورسٹی کے صدر دروازے کے بالکل سامنے ہے۔ یونیورسٹی کے طلبہ بالعموم اِسی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ یونیورسٹی کے صدر دروازہ پر قرآن کریم کی یہ آیت جلی حروف میں کندہ ہے کہ: "لَا یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ"۔ جامع بایزید نہایت وسیع و عریض مسجد ہے اور ہزاروں نمازیوں کے لیے اس میں گنجائش ہے۔ نماز تراویح میں میرے اندازے کے مطابق دس ہزار کے قریب نمازی موجود تھے

عورتوں کی تعداد بھی دو ڈھائی سو سے کم نہ ہو گی۔ عورتوں کے لیے مسجد میں ایک الگ جگہ مخصوص ہے جسے ترک گوشۂ خانم کہتے ہیں۔

دو عربی آشنا دوستوں سے تعارف نماز تراویح کے بعد ہوٹل میں واپس آ رہا تھا کہ راستے میں اتفاقاً ایک ترک نوجوان سے تعارف ہو گیا۔ میں نے راستے میں ایک دکان سے سحری کے لیے پھل خریدے اور جب دام دینے لگا تو اس نوجوان نے جو میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا دکاندار سے کہا کہ دام میں دوں گا، اس پاکستانی سے دام نہ لینا۔ چنانچہ دام اُس نے ہی ادا کیے۔ بعد میں اِس نوجوان سے جب بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان کا نام عبدالقادر سیزگین ہے۔ استنبول کے مدرسہ امام و خطیب کے فارغ شدہ ہیں اور اب استنبول یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف ہائر اسلامک اسٹڈیز میں پڑھتے ہیں اور آخری سال میں ہیں۔ مولانا محترم کی وہ تمام کتابیں جو اب تک ترکی میں ترجمہ ہو چکی ہیں پڑھ چکے ہیں۔ عربی زبان پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں مگر بولنے پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے۔ عبدالقادر سیزگین کی وساطت سے استنبول کے احباب سے ملنے کا موقع نکل آیا۔ عبدالقادر سیزگین میری بات تو خوب سمجھ لیتا تھا مگر بے چارا اپنا مافی الضمیر ادا کرنے پر قادر نہ تھا۔ اُس کا چہرہ بتاتا تھا کہ جذبات سے بھرپور ہے۔ رات دیر تک میرے پاس ہوٹل میں بیٹھا رہا اور اپنی شکستہ عربی سے میری تنہائی کو ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دوسرے روز علی الصبح ایک اچھے عربی دان دوست کو ساتھ لے آیا۔ یہ صاحب بھی ہمارے پرانے آشنا نکلے۔ ان کا نام محمد شاہین ہے۔ جامع لالالی کے خطیب ہیں اسلامی مجلہ ہلال کے ادارۂ تحریر میں شامل ہیں۔ عربی زبان خوب جانتے ہیں اور ہلال کے اندر مولانا محترم کے جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر انہوں نے ہی عربی سے ترکی میں ترجمہ کیے ہیں۔

عربی زبان کی سخت جانی عبدالقادر سیزگین کی سرگرمی اور تعاون کی بدولت ہمر ہوٹل میں دوستوں کی آمد شروع ہو گئی۔ استنبول کے مدرسۂ امام و خطیب کے طلبہ اور اساتذہ کی ایک تعداد بھی آ گئی۔ پروفیسر عزیز، نائف آفندی اور شیخ یوسف اور کئی دوسرے دوست جمع ہو گئے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک مولانا محترم کا ترکی لٹریچر پڑھ چکا ہے اور صرف اسلامی اخوت کی بنیاد پر ہی اظہارِ محبت نہیں کر رہا ہے بلکہ تحریکی جذبہ کی ہم آہنگی بھی اس محبت میں شامل ہے۔ ترکی آنے سے پہلے جس بات کا ہر وقت خدشہ لاحق رہتا تھا وہ زبان کا مسئلہ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ترکی میں عربی بولنے والے شاذ و نادر ہوں گے۔ کیونکہ مصطفیٰ کمال اور اُس کے ناعاقبت اندیش ساتھیوں نے عربی زبان اور عربی

رسم الخط کو ترکی کے اندر ختم کرنے کے لیے جس تشدد اور سفاکیت کا مظاہرہ کیا ہے اُس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسرائیل بھی عربی کے بجائے عبرانی زبان کو رائج کر رہا ہے، مگر تشدد کے بجائے دوسرے کارگر ہتھکنڈوں کے ذریعے۔ ترکی میں اس تشدد اور سفاکیت کے باوجود اور عربی کے لیے ہر طرح کے دروازے بند کر دینے کے علی الرغم آج عربی بولنے والوں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ اِسے عربی کی سخت جانی اور اسلام کا معجزہ قرار دے لیں یا طورانی جماعت کی غلط اندیشی۔

دو سوال | دن بھر ہوٹل میں رہا۔ احباب تشریف لاتے رہے۔ ہر شخص کی زبان سے سب سے پہلے جو سوال نکلتا تھا وہ یہ تھا کہ "حضرت مودودی کی صحت کیسی ہے؟" یہ وہ سوال تھا کہ اِس سفر میں مَیں جہاں جہاں گیا ہوں سب سے پہلے اِس سوال کا جواب دینا ہوتا تھا۔ مولانا محترم کے سفرِ لندن اور پھر اپریشنوں کی خبر دنیا میں اِس قدر پھیلی ہے کہ ہر شخص کی نگاہیں مولانا محترم پر لگی ہوئی تھیں اور وہ مولانا محترم کی صحت کی خبر سننے کے لیے بیتاب تھا۔ مولانا محترم جب علاج کے لیے لندن روانہ ہوئے تو ہمیں ایک ثقہ عرب دوست نے بتایا کہ پاکستان کے بعض سرکاری حلقوں کی طرف سے عربوں کے اندر یہ پروپگنڈا کیا جا رہا ہے کہ مولانا برطانیہ میں علاج کی غرض سے نہیں گئے بلکہ دوسرے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے گئے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے افترا پردازی کرنے والوں کو اِس مرتبہ بھی اُسی طرح رُوسیاہ اور خائب و خاسر کیا جس طرح وہ پہلے ایسے لوگوں کو رُسوا کرتا رہا ہے۔ مَیں جب دوستوں کو مولانا محترم کی صحت کی بشارت دیتا تو وہ بڑے شاداں ہوتے اور اللہ کا شکر بجا لاتے۔ ترکی کے اخبارات میں بھی مولانا محترم کے اپریشنوں کی خبریں وقتاً فوقتاً چھپتی رہی ہیں اور استنبول سے اَدَنہ تک کے لوگ صورتِ احوال سے کسی نہ کسی حد تک آگاہ رہے ہیں۔

دوسرا مجھ سے سوال بار بار یہ کیا گیا کہ مولانا محترم ترکی کب تشریف لا رہے ہیں۔ راقم الحروف اس سوال کا قطعی جواب دینے سے معذور تھا۔ اس لیے کہ اِس امر کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مولانا محترم پاکستان جاتے ہوئے راستے میں ترکی یا کسی اور مقام پر ٹھیرنے کی ہمت رکھتے ہیں یا نہیں۔ بہرحال ترکی میں یہ خبر عام تھی کہ مولانا محترم ترکی ٹھیریں گے اور ایک کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ لوگ اِس خبر پر بے حد مسرور تھے اور انتظار کے ایّام گن رہے تھے۔ مَیں ترکی میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا۔ ہر شخص مجھ سے مولانا محترم کے ترکی میں پہنچنے کی تاریخ پوچھنے لگا۔

امام و خطیب ہائی اسکول میں افطاری | مدرسہ امام و خطیب کے پرنسپل کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ آج

شام میری افطاری کی دعوت مدرسہ میں ہے۔ سارا دن ہوٹل میں گزرا۔ شام کو عبدالقادر سیزگن کی معیت میں مدرسہ امام خطیب گیا۔ یہ مدرسہ استنبول کی مشہور مسجد جامع محمد الفاتح کے قریب ہے۔ مدرسہ کے دروازے پر مدرسہ کے پرنسپل اور اساتذۂ کرام نے میرا استقبال کیا۔ اساتذہ سے الگ الگ تعارف کرایا گیا۔ اساتذہ کے اندر عربی جاننے والوں کی ایک تعداد تو موجود تھی ہی، ایک ایسے اُستاذ بھی ملے جو اُردو زبان بھی نہایت اعلیٰ بولتے ہیں۔ مَیں نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا آپ اصلاً ترک ہیں یا ہندوستانی؟ بتانے لگے کہ میں خالصتہً ترک ہوں۔ البتہ مجھے اردو سیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس غرض کے لیے میں لکھنؤ گیا اور وہاں تین سال تک رہا ہوں، اور لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضلِ ادب کی ڈگری حاصل کی ہے۔ انہوں نے اپنا نام یوسف صالح قرجہ بتایا۔ یہ اس وقت امام خطیب ہائی اسکول میں بھی لیکچرر ہیں اور استنبول یونیورسٹی کے ہائر اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ میں بھی پروفیسر ہیں۔ ۴۰ سال کے بھرپور اور صحت مند نوجوان ہیں۔ ایک غیر ملکی مسلمان کا اِس قدر شوق سے اُردو سیکھنا اور پھر اس سے دین کی خدمت کا کام لینا بہت قابلِ قدر بات ہے۔ آج تک مجھے کوئی ایسا عرب نہیں ملا جس نے باقاعدہ اُردو زبان کو اس ذوق و شوق سے سیکھا ہو اور اسے دعوتِ دین کا ذریعہ بنایا ہو۔ عرب اس فضیلت سے محروم ہیں۔ البتہ انہیں انگریزی سیکھنے اور بولنے کا بے حد شوق ہے۔ سعودی عرب کے اندر تو نوجوانوں کو انگریزی سیکھنے کا اِس قدر جنون لاحق ہوتا جا رہا ہے کہ خود اپنی عربی سے اب انہیں نفرت سی ہونے لگی ہے۔

امام و خطیب ہائی اسکول کی اجتماعی افطاریاں مدرسہ امام و خطیب کے اندر افطاری کا وسیع دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ پرنسپل صاحب نے بتایا کہ پورے رمضان میں یہ دسترخوان بچھا رہا ہے۔ پرنسپل جو ایک سابق فوجی جرنیل ہیں اور بہترین منتظم ہیں نے بتایا کہ ان افطاریوں کا پس منظر یہ ہے کہ یہ افطاریاں اسکول یا طلبہ کے حساب میں نہیں ہوتیں بلکہ شہر کے صاحبِ ثروت حضرات میں سے کوئی نہ کوئی شخص ایک افطاری اپنے ذمہ لے لیتا ہے، وہ خود بھی اس میں شریک ہوتا ہے اور شہر کے دیگر معززین کو بھی شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ اِس طرح نہ صرف یہ افطاری ایک روحانی اجتماع کی صورت اختیار کر جاتی ہے بلکہ طلبہ اور اساتذہ کو شہر کے اچھے اچھے لوگوں سے ملنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ آج کی افطاری کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اس میں دو ہزار کی حاضری ہے۔ ایک ہزار ۳ سو طلبہ ہیں اور ۵۰ اساتذہ کچھ اسکول کے دوسرے متفرقہ حضرات ہیں مثلاً ڈاکٹر اور ناظمینِ شعبہ جات وغیرہ۔ اور باقی معززینِ شہر ہیں۔ معززینِ شہر میں اسمبلی کے ارکان، یونیورسٹی کے پروفیسر،

اور تجار اور وکلاء شامل ہیں۔ علماء کی ایک جماعت بھی موجود ہے۔ ترکی کے معمر شیخ الاسلام بھی موجود ہیں جو عثمانی دور کے آخری ایام میں اِس منصب پر فائز تھے اور مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو کے دَور میں بھی اپنی عوامی مقبولیت اور علم و فضل کی وجہ سے قابلِ احترام سمجھے جاتے رہے ہیں اور ان سے تعرض کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔ جن صاحب کی طرف سے افطاری کی دعوت دی گئی ہے پرنسپل صاحب نے اُن سے خصوصی تعارف کرایا۔ تعارف سے معلوم ہُوا کہ وہ استنبول کے بہت اونچے تاجروں میں سے ہیں۔ استنبول میں اُن کا ایک اعلیٰ درجے کا ریسٹورنٹ ہے جو اصحابِ ذوق کا مرجع ہے انہوں نے مدرسہ امام و خطیب کے طلبہ و اساتذہ اور شہر کے ائمہ اور مفتیوں کے لیے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ ان میں سے کوئی اگر ان کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائے یا چائے پیئے تو اُس سے پچیس فیصد کم دام لیے جائیں گے۔ اہلِ دین سے ترکوں کو جو محبت ہے یہ اُس کا ایک معمولی سا ثبوت ہے۔

افطاری میں میرے بائیں جانب جناب شیخ الاسلام عمر نصوحی صاحب تشریف فرما تھے۔ کافی ضعیف العمر ہیں۔ دھیمے انداز میں بات کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ اب حضرت مودودی کا کیا حال ہے۔ خاکسار نے عرض کیا کہ اُن کا دوسرا اپریشن بھی ہو گیا ہے جو بفضلِ خدا کامیاب رہا ہے، اور اب وہ چند روز تک پاکستان واپس لوٹنے والے ہیں شیخ الاسلام فرمانے لگے اللہ تعالیٰ حضرت کو کامل صحت اور طویل زندگی عطا فرمائے۔ مجھے اُن سے بڑی محبت ہے۔ اُن کی کتابیں ہمارے نوجوانوں کے اندر دین کی صحیح اسپرٹ پیدا کر رہی ہیں۔ میری تمنّا ہے کہ وہ لندن سے واپسی پر یہاں چند روز کے لیے تشریف لائیں۔

تقریریں | افطاری کے بعد مختصر تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے بھی تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ پرنسپل صاحب نے یوسف صالح قرجہ کو ترجمانی کے لیے کہا۔ محفل میں باقاعدہ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام تھا۔ نشستوں کی ترتیب میں بڑے سلیقہ کا ثبوت دیا گیا تھا۔ ۲ ہزار کی تعداد کے لیے میزوں اور کرسیوں کا کھلا انتظام تھا۔ یوسف صالح قرجہ نے بتایا کہ میری تقریر کا موضوع ہے "جماعتِ اسلامی پاکستان کا تعارف"۔ میں نے جب اِس موضوع کے بارے میں کچھ تردد کا اظہار کیا تو قرجہ صاحب کہنے لگے کہ اِس وقت تمام دوستوں کی یہی خواہش ہے۔ یہاں جتنی حاضری آپ دیکھ رہے ہیں یہ لوگ مولانا مودودی کو نہ صرف جانتے ہیں بلکہ اُن کی کتابیں پڑھ چکے ہیں اور ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہو گی کہ آپ مولانا مودودی کی جماعت کا مختصراً تعارف انہیں کرا دیں۔ چنانچہ حاضرین کے اصرار پر

اٹھ کھڑا ہوا۔ شیخ الاسلام صاحب نے بھی تھپکی دی کہ میں کچھ نہ کچھ ضرور بیان کروں۔

میرے سامنے جو حاضرین موجود تھے انہیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ امام و خطیب اسکول کے نام سے طلبہ اور اساتذہ کا جو تصور میں نے قائم کر رکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ میرا خیال تھا کہ ان مدارس میں اُسی نوعیت کے اماموں اور خطیبوں کی کھیپ تیار ہو رہی ہے جو ہندو پاکستان کے اکثر دینی مدارس میں تیار ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ یہاں تازہ دم صحت مند، زندگی کی توانائیوں سے بھرپور عنصر جمع ہے۔ ان کے چہرے غمازی کر رہے ہیں کہ دین سے گہرا عشق ان کو اس ادارے میں کھینچ لایا ہے۔ چنانچہ میں نے اسی احساس کے تحت اُن کے سامنے مختصر سی تقریر کی۔ جس میں میں نے پہلے جماعت کی تاریخ اور دعوت اور مقصد و طریق کار پر اجمالی سا اشارہ کیا اور پھر میں نے ترکوں کی تاریخ اور ترکوں کی عظیم الشان اسلامی خدمات کو بیان کیا۔ میں نے کہا کہ عثمانی ترکوں نے یورپ اور ایشیا میں ۸ سو سال تک اسلام کا جھنڈا لہرایا ہے۔ اب پھر زمانہ اس انتظار میں ہے کہ یہ جری اور بہادر قوم اسلام کا جھنڈا ہاتھ میں لے اور کفر و الحاد کی تاریکیوں میں اسلام کی شمع روشن کرے۔ آپ کے یہ مدارس جنہیں آپ مدارس ائمہ و خطباء کہتے ہیں یہ غازیانِ اسلام کی تربیت گاہیں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے چشمے ہیں۔ امید ہے یہی مدارس ترک قوم کو بیدار کرنے اور اسے اپنے اصل مشن سے باخبر کرنے کا فرض سرانجام دیں گے۔ ماضی میں اگر فولادی ہتھیاروں کو جہاد کے میدان میں استعمال کیا گیا ہے تو اب اِس زمانے میں فکری اور علمی اسلحہ کے بغیر اس جہاد میں کامیابی نہیں ہو سکے گی۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ آپ میں سے ہر ہر فرد محمد الفاتح بن کر اٹھے گا اور باطل کی اس یلغار کو جو کفر و الحاد اور یہودیت و صلیبیت کے مختلف پردوں میں اسلامی دنیا پر حملہ آور ہو رہی ہے اُس کا سدِباب کرے گا۔

ترک نوجوانوں کا اسلام سے لگاؤ: میں نے مختصراً اپنے خیالاتِ پریشاں پیش کر دیئے۔ ترجمہ صاحب نے ترجمانی کی۔ مگر میں اس بات پر خاصا حیران رہا کہ میری ان گزارشات کا اسکول کے نوجوانوں نے بڑا خیر مقدم کیا۔ اور اسلام اور اسلامی جہاد اور اسلامی عظمت کی بحالی کے الفاظ پر جی بھر کر تالیاں بجائیں۔ پاکستان یا سعودی عرب میں تو اسلام کا نعرہ لگا دینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ مگر ترکی کے نوجوان عنصر کے اندر جس کی پرورش ہی لادینی دستور، لادینی نظامِ حکومت، لادینی تہذیب اور لادینی حکمرانوں کے زیرِ اثر ہوتی ہے اُس کا اسلام کے نام پر اس قدر اچھل پڑنا فی الواقع ایک زندہ معجزہ سے کم نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ اسلام کا احیاء ترکی کی تنگ و تاریک گلیوں میں ہو رہا ہوگا۔ مگر یہاں آکر

معلوم ہوتا کہ کھلے بازار میں اسلام کا نعرۂ حق گونج رہا ہے۔ مسجد سے بھی یہ آواز اٹھ رہی ہے اور مدرسہ سے بھی۔ اور اسے اٹھانے والے بوڑھے نہیں ہیں، بہترین دم خم رکھنے والے نوجوان ہیں۔

پارلیمنٹ کے ایک رکن کی جوابی تقریر میری تقریر کے بعد ترکی پارلیمنٹ کے ایک رکن جناب عثمان سراج اُٹھے اور انھوں نے میری گزارشات کی تائید کرتے ہوئے علی الاعلان کہا کہ ہم یہاں احیائے اسلام کی پوری کوشش کر رہے ہیں میں نوجوانوں کو ہر محفل میں اس فرض کی جانب متوجہ کر رہا ہوں۔ اور امید ہے ترکی کا نوجوان مستقبل قریب میں اُن تمام امیدوں کو بروئے کار لانے کا اہل ثابت ہو گا جن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اجتماع منتشر ہو گیا۔ شیخ عمر نصوحی صاحب نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اور ہم پرنسپل صاحب کے کمرے میں چلے گئے۔ وہیں نماز مغرب ادا کی۔ نماز کے بعد شیخ عمر نصوحی، یوسف صالح ترجیہ اور پرنسپل صاحب اور کچھ دوسرے حضرات سے بات چیت ہوتی رہی۔

شیخ الاسلام عمر نصوحی شیخ عمر نصوحی کا پورے ملک میں بڑا زبردست احترام پایا جاتا ہے۔ موصوف کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اِن میں سے کچھ چھپ چکی ہیں اور اکثر غیر مطبوعہ ہیں۔ تفسیر اور مفسرین کی تاریخ پر بھی کئی جلدوں میں ان کی ایک تصنیف ہے جسے ترکی کے محکمہ امور مذہبی نے شائع کیا ہے۔ اسلامی فقہ پر موصوف کو زبردست عبور حاصل ہے۔ انہوں نے اُس دور میں بھی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ہے جب یہ شغل جاری رکھنے والوں کے سر قلم ہوتے رہے اور دین کو پکڑ کر رکھنا آگ کا انگارہ مٹھی میں لینے کے مترادف تھا۔

ترکی میں لادینیت کی تاریخ میں نے یہ موقع غنیمت سمجھ کر شیخ عمر نصوحی سے اُس دور کے حالات سننے کی خواہش ظاہر کی جب ترک قوم کو دین سے بیگانہ کرنے کی مہم چل رہی تھی۔ کیونکہ شیخ عمر نصوحی نہ صرف یہ کہ اس دور کے عینی شاہد ہیں بلکہ خود ان حالات کو بھگت چکے ہیں۔ شیخ نصوحی پچھلے حالات کو چھیڑنا پسند نہ کرتے تھے۔ انہوں نے اِس پر مسرت کا اظہار کیا کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے دین پر جو طوفان خیز آزمائشیں ٹوٹیں اور پورا ملک ایک شبِ تاریک میں تبدیل ہو گیا، وہ اب ختم ہو رہی ہیں اور قبل اس کے کہ وہ اِس دنیا سے رخصت ہوں اپنی آنکھوں سے نوجوانوں کا دین کی عام بیداری کے ایمان افروز منظر دیکھ رہے ہیں۔ شیخ نے بتایا کہ ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک جو ملک اسلام کا گہوارہ رہا، بلکہ اسلام کا محافظ رہا، اُسے صرف آٹھ سال کے اندر اسلام سے بیگانہ کرنے کی کوشش کی گئی

۱۹۲۴ء سے تبدیلی کا یہ سلسلہ شروع ہوا اور ۱۹۳۲ء تک جاری رہا۔ موضوع نازک تھا۔ سب کے دلوں کے تار ہل گئے۔ مجلس میں ایک اور صاحبِ علم بیٹھے تھے۔ انہوں نے تاریخی ترتیب کی رعایت سے بتایا کہ سلطان محمد وحیدالدین آخری عثمانی خلیفہ تھے مصطفیٰ کمال نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو انہیں اختیارات سے محروم کر دیا اور صرف امورِ مذہبی کے سربراہ کی حیثیت سے ان کو باقی رکھا۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو گرانڈ نیشنل اسمبلی نے خلافت پر بھی خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ اسمبلی نے اسی اجلاس میں وزارتِ شریعت اور وزارتِ اوقاف کو بھی منسوخ کر دیا۔ کچھ دنوں بعد شرعی عدالتیں ختم کر کے انہیں سول عدالتوں کے اندر ضم کر دیا گیا۔ اس کے بعد مصطفیٰ کمال نے دوسرا بھرپور قدم اٹھایا اور تمام دینی مدارس اور دینی اداروں کو بند کر دیا اور ایک بے اختیار اور نیم مُردہ سا مذہبی ادارہ "محکمۂ امورِ مذہبی" کے نام سے کھول دیا۔ بلکہ حکومت نے دینی تعلیم کے معاملے میں یہاں تک تشدد برتا کہ پرائمری اسکولوں کے اندر چھوٹے چھوٹے بچوں کو یہ سکھانا شروع کر دیا کہ ہماری پسماندگی کا اصل سبب دین ہے۔ ترکوں کو جتنے مصائب و حوادث کا سامنا کرنا پڑا ہے ان سب کا ذمہ دار دین ہے۔ حکومت نے باقاعدہ سابقہ ترکی دستور کے اندر سے یہ یہ فقرہ حذف کر دیا کہ "ریاست کا مذہب اسلام ہوگا"۔ اس تبدیلی کے بعد تمام اسلامی قوانین منسوخ کر دیئے۔ اسلامی شریعت کو یہ لوگ "شریعتِ عتیقت" کہتے تھے یعنی بوسیدہ قانون۔ اسلامی قوانین کے بجائے ان لوگوں نے سوئٹزر لینڈ کا سول لا اور اٹلی کا فوجداری قانون عوام الناس کی روایات و عادات کا لحاظ کیے بغیر ٹھونس دیا۔ شروع شروع میں تو خود جج ان نئے اور نامانوس قوانین کی وجہ سے سخت ذہنی اور فکری پراگندگی میں مبتلا ہو گئے اور عدالتوں کے اندر کئی کئی سال تک مقدمات فیصلہ کے بغیر پڑے رہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس صوفیاء کے تمام سلسلے بھی ممنوع قرار دے دیئے اور عیسائی پادریوں کی طرح علماء کے لیے ایک خاص یونیفارم مقرر کیا۔ یعنی سیاہ جبہ اور سفید عمامہ۔ عوام الناس کو ہیٹ اور سوٹ پہننے پر مجبور کیا گیا۔ ایک کروڑ باشندوں کے لیے یکایک اتنی بڑی مقدار میں ہیٹ فراہم کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس غرض کے لیے یورپ بھر سے ہر طرح کا ردی (CONDEMNED) مال درآمد کیا گیا۔ جمعۃ المبارک کے بجائے اتوار کو چھٹی کا دن قرار دیا گیا۔ حکومت نے مذہبی احساسات کو یہاں تک کچلنے کی کوشش کی کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے اجتماعات بھی اسے گوارا نہ تھے۔ اس نے ان اجتماعات کو بھی پہلے خلافِ قانون قرار دے دیا اور پھر اس قانون پر جب بہت اضطراب پیدا ہوا تو اسے تبدیل کر دیا

گیا۔ ہجری جنتری کو ختم کر دیا گیا۔ عربی اذان ممنوع قرار دے دی۔ وراثت کے قانون میں بنیادی تبدیلی کر ڈالی اور مرد و عورت کو وراثت میں برابر کا حصہ دار ٹھیرا دیا گیا۔ وراثت کے اصل حصہ داروں (ذوی الارحام) کو فروع بنا دیا اور قانونی نظام کے اندر ایسا انتشار پیدا ہوا کہ توبہ ہی بھلی۔ ترکی کا اسلام سے ہر طرح کا رشتہ کاٹنے کے لیے بالآخر دارالحکومت کو استنبول سے انقرہ منتقل کر دیا گیا کیونکہ استنبول مسجدوں اور مذہبی اداروں کا شہر ہے اور یہاں کے چپے چپے سے عثمانی تہذیب جھلک رہی ہے۔ اس لیے ایک نئی زندگی کا افتتاح کرنے کے لیے یہ شہر موزوں نہ سمجھا گیا۔ انقرہ بالکل ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ اُسے دارالحکومت بنا دیا گیا اور شہر کے اندر مسجد کی تعمیر ممنوع قرار دی گئی۔

ترکی کی ماضی قریب کی یہ داستان جب بیان کرنے والا بیان کر رہا تھا تو سب لوگ چپ چاپ بیٹھے سن رہے تھے۔ اُن کے چہروں کا بدلتا ہوا رنگ بتا رہا تھا کہ اِس داستان نے اُن کے پُرانے زخم تازہ کر دیئے ہیں۔ جو صاحب ان واقعات کو دہرا رہے تھے انہوں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس ملک پر سب سے زیادہ آزمائش کی گھڑی وہ تھی جب عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط نافذ کیا گیا۔ یہ تبدیلی چونکہ تاریخ، فطرت اور روایات کے سراسر خلاف اور معقولیت کے ہر پہلو سے عاری تھی اس لیے نہ صرف عوام کے لیے اس کو قبول کرنا آسان نہ تھا بلکہ خود حکومت کو بھی سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت نے اپنے تمام ذرائع اِس تبدیلی پر لگا دیئے اور اُن تمام لوگوں کو جو لاطینی حروف کا علم رکھتے تھے جمع کیا گیا اور انہیں عوام کی تعلیم کے لیے بجبر مامور کیا گیا۔ ۲۰ اگست ۱۹۲۸ء کو پہلی مرتبہ انقرہ کے اندر لاطینی حروف کے رواج کا اعلان کیا گیا اور اس اعلان کے ساتھ وہ تمام مطبوعہ کتابیں جو عربی زبان میں موجود تھیں انہیں جمع کر کے مصر، ایران اور دوسرے ممالک کو برآمد کر دیا گیا۔ چھاپہ خانہ والوں کو حکم دے دیا گیا کہ وہ عربی حروف کی پلیٹیں چھاپہ خانوں میں نہیں رکھ سکتے۔ کالجوں کے نصاب میں سے عربی اور فارسی زبانیں نکال دی گئیں کیونکہ اب اُن کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ ترکی زبان کے اندر سے عربی اور فارسی کے الفاظ کو چُن چُن کر نکالا گیا اور اُن کے بجائے ترکی زبان کے عامی الفاظ کو شامل کیا گیا یا فرانسیسی الفاظ کو اختیار کیا گیا۔ ۱۹۴۵ء میں ترکی کا دستور لاطینی زبان میں شائع ہوا۔

(باقی)

اسلامی بین الاقوامی تنظیمات کی قراردادیں

(گذشتہ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں بین الاسلامی تنظیموں کی چار اہم کانفرنسیں منعقد ہوئی ہیں۔ ایک قاہرہ میں، دو مکہ معظمہ میں اور ایک عمان (اردن) میں۔

۱۔ قاہرہ میں اس کا اہتمام مجمع البحوث الاسلامیہ نے کیا۔

۲۔ مکہ معظمہ میں رابطہ عالمِ اسلامی کے زیرِ اہتمام بین الاسلامی تنظیموں کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں درجِ ذیل تنظیموں نے حصہ لیا۔

۱۔ مؤتمر عالم اسلامی، (کراچی۔ پاکستان)۔

۲۔ افروشیائی اسلامی تنظیم، (جاکارتا۔ انڈونیشیا)۔

۳۔ المجلس الاعلیٰ للشؤون الاسلامیہ، (قاہرہ)۔

۴۔ المؤتمر الاسلامی العام لشؤون فلسطین، (عمان)۔

۵۔ رابطہ عالم اسلامی، (مکہ معظمہ)۔

۳۔ رابطہ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کا اجلاس، (مکہ معظمہ)۔

۴۔ اسلامی محاذ، (عمان۔ اردن)

عمان میں اسلامی محاذ کے زیرِ اہتمام معراج کی تقریبات کے موقع پر کانفرنس منعقد ہوئی ہے، اس میں مندرجہ بالا تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس لیے یہ کانفرنس جملہ کانفرنسوں میں کامیاب ترین رہی۔ اور اس نے ان چاروں کانفرنسوں کی قراردادوں کی تائید و توثیق کی ہے۔ ان قراردادوں میں سب سے اہم قرارداد یہ ہے کہ شرق اوسط کے المیے کا مداوا جہاد ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ رابطہ عالم اسلامی اور عمان کے اسلامی محاذ کی اہم قراردادوں کا ترجمہ و تلخیص پیشِ خدمت ہے)

(۱)

قرارداد ھائے

رابطۃ العالم الاسلامی، مکہ مکرمہ

مسئلہ فلسطین

رابطہ عالم اسلامی کی مجلس اساسی اس بات کا پُرزور اعلان کرتی ہے کہ عالمِ اسلام اس وقت تک ہرگز چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک کہ وہ فلسطین کے اسلامی علاقے کا آخری انچ تک آزاد نہیں کرائے گا خواہ اس کے لیے اسے کتنے ہی مصائب برداشت کرنے پڑیں، اور قربانیاں پیش کرنی پڑیں۔ جب تک یہ علاقہ آزاد نہیں ہو جاتا اس وقت تک اس علاقے میں امن قائم ہونا محال ہے۔ اور مسلسل صہیونی جارحیت کی بنا پر ہم بھی دائمی طور پر جہاد جاری رکھیں گے۔ یہاں تک کہ حق باطل پر غالب آجائے۔

— مجلس اساسی جہادِ فلسطین کی ان ساری قراردادوں کی پوری پوری تائید کرتی ہے جنہیں عالمی اسلامی تنظیموں کی کانفرنس منعقدہ مکہ معظمہ اور مجمع البحوث الاسلامیہ کی کانفرنس نے جو ۱۴ رجب ۱۳۸۸ھ کو قاہرہ میں منعقد ہوئی تھی۔

— مجلس اساسی اُن حلقوں کے خلاف بھی شدید احتجاج کرتی ہے، جو عربوں پر دباؤ ڈال رہے ہیں اور انہیں اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کرلیں، بجائے اس کے کہ وہ ۵ جون کی جنگ میں غصب شدہ علاقے کا مطالبہ کریں۔

— مجلسِ اساسی کی قطعی رائے یہ ہے کہ صہیونیوں کے خلاف مسلسل جہاد جاری رکھا جائے یہاں تک کہ ہم کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ اس غرض کے لیے درجِ ذیل امور پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے:

۱۔ جہاد کے لیے ہمیں اپنی مادی اور معنوی ساری قوتوں کو یکجا کر لینا ضروری ہے۔ جس کے لیے مجلسِ اساسی اسلامی ممالک سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے سارے اسباب و وسائل کو مجتمع کرنے کے اقدامات کریں۔

۲۔ہماری افواج میں اسلامی اخلاق و کردار اور اسلامی روح کو اُجاگر کیا جائے تاکہ ہماری افواج صحیح اسلامی عساکر کا نمونہ پیش کریں، اور اللہ کی راہ میں جان سپاری کے جذبے سے لبریز ہوں۔

۳۔تحریک آزادی فلسطین (الفتح ۔ العاصفہ) کے جہاد کی پُشت پناہی کی جائے، نیز ان کو اس طرح منظم و مرتب کر دیا جائے کہ ان کا جہاد صحیح معنوں میں جہاد اسلامی شمار ہو۔

۴۔سعودی عرب کی حکومت کو بھی چاہیے کہ وہ ان اہم اسلامی مسائل کے حل میں پُورا پُورا حصہ لے، اور اللہ کی خوشنودی اور مسلمانوں کی خواہشات کے مطابق مسلسل جدوجہد جاری رکھے۔

——یہودیوں کو فنٹیم طیارے دینے کے بارے میں امریکی پالیسی پر یہ مجلس شدید احتجاج کرتی ہے۔ اور اسلامی ممالک کے خلاف استعمال کیے جانے والے دوسرے اسلحہ کی ترسیل پر بھی شدید اضطراب کا اظہار کرتی ہے۔ ان احتجاجات کو برقیے کی شکل میں امریکی صدر کو روانہ کیا جائے گا۔

مجلس اپنے سابقہ (نویں) اجلاس کی قراردادوں کی تجدید و توثیق کرتے ہوئے اس رائے کا حتمی اظہار کرتی ہے کہ اسلامی ممالک کو اسرائیل اور صہیونیوں کا پورا پُورا مقاطعہ کرنا چاہیے۔ اور ان اقدامات سے پیشتر آپس میں ضروری صلاح و مشورہ بھی ہو جانا چاہیے، تاکہ یہ مقاطعہ دُور رس نتائج کا حامل ہو۔

اور ہم ان ممالک سے بھی امید رکھتے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی صورت میں اسرائیل کو تسلیم کر رکھا ہے، کہ وہ جلد از جلد اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں اور اس سے تعلقات ختم کر دیں۔

مجلس اساسی اس بات کی بھی اپیل کرتی ہے کہ غیر ملکی طاقتوں کے پروپگنڈے کا سدباب کیا جائے کیونکہ یہ ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں میں بددلی اور مایوسی پھیلا رہے ہیں۔

مجلس اسلامی ممالک سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اسرائیل کے بارے میں اپنے فرض کو پہچانیں اور تساہل کے بجائے عملی اقدام کریں، جس کے لیے وہ اپنے ہاں جبری فوجی بھرتی اور لازمی عسکری تربیت رائج کریں۔

اتحادِ عالمِ اسلامی

اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے چونکہ اجتماعی جدوجہد ضروری ہے، جو اتحاد عالمِ اسلامی کے بغیر

ممکن نہیں، اور رابطہ عالم اسلامی نے اس نقطۂ نظر کی روشنی میں جہاں تک ممکن ہو سکا مسلمانوں کے معاملات و حالات کا جائزہ لیا، ان کے دلوں کو ٹٹولا، اور یہ پیغام جہاں کہیں بھی پہنچا مسلمانوں نے اسے دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہی اور اس کی پوری پوری تائید کی۔ لہٰذا موجودہ صورتِ حال میں جبکہ عالمِ اسلام گوناگوں مسائل میں گھرا ہوا ہے مجلس اساسی کی رائے میں یہی وہ وقت ہے جس میں سربراہانِ عالمِ اسلام کی کانفرنس منعقد ہونی چاہیے۔

مخالفانہ پروپگنڈا

رابطہ کے سکرٹریٹ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم عوام کو کمیونسٹوں اور ملحدوں کی سرگرمیوں اور پروپگنڈوں سے خبردار کرتا رہے، اور انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس دلاتا رہے کہ وہ اپنے جملہ ممکنہ وسائل سے ان کا سدِباب کریں۔

(۲)

محاذ اسلامی، اُردن کی قراردادیں

۱۔ یہ کانفرنس مسلمانوں کو آگاہ کرتی ہے کہ صہیونیوں کی جارحانہ کارروائیاں فلسطین تک محدود نہیں ہیں گی بلکہ ان کی نظریں سارے عالمِ اسلام پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے نشانات تک محو کر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس خطرناک ترین دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔

۲۔ صہیونی جس ڈھٹائی سے مسلسل مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں، اور ان کے مقدس مقامات میں من مانی تبدیلیاں کر رہے ہیں، خاص طور پر جو کچھ انہوں نے بیت المقدس اور الخلیل میں کیا ہے، یہ اقدامات اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ وہ عنقریب فلسطین کے علاوہ سارے عالمِ اسلام میں شعائر اللہ کو پیوندِ خاک کرنے کے عزائم رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ کانفرنس دنیا کے مسلمانوں سے اور اسلامی حکومتوں سے پُرزور مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ان مقدس مقامات اور سرزمینِ فلسطین کو آزاد کرانے کے لیے اجتماعی جدوجہد کریں۔

۳۔ عربوں کی شکست پر ہم اب جو کڑوے گھونٹ پی رہے ہیں ان کا حقیقی سبب یہ تھا کہ ہم نے یہ جنگ نظریہ اسلامی کی بنیاد پر نہیں لڑی تھی، حالانکہ مسئلہ فلسطین خالص اسلامی اور سارے مسلمانوں کا مسئلہ تھا۔ تاریخ

سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہماری زندگی، ترقی اور کامیابی کا واحد سرچشمہ نظریۂ اسلامی ہی تھا جس کی بنیاد پر ہم نے ہر جارح اور غاصب کا منہ توڑ جواب دیا۔ اس لیے یہ کانفرنس عربی اور اسلامی دنیا کو اس اصل حقیقت کی طرف پوری طرح متوجہ کرتی ہے۔

۴۔ اس کانفرنس کی قطعی اور محکم رائے یہ ہے کہ جس المیے کے نتیجے میں سرزمین فلسطین اور مسجد اقصیٰ تک غصب کر لی گئی ہے، اس کے بعد اب مسلمانوں کے پاس اور کوئی بھی ایسا عذر باقی نہیں ہے کہ وہ اس نزاع کا جہاد کے سوا کوئی اور حل تلاش کریں۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم غاصبوں سے فلسطین کا ایک ایک انچ آزاد کرا دیں اور صہیونیت کے آثار کا خاتمہ کر دیں۔

یہ کانفرنس مسلمانوں کو اس جہاد مقدس کی طرف دعوت دینے کے ساتھ ہی عربی و اسلامی حکومتوں سے بھی یہ پر زور مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ان لوگوں کے لیے پوری پوری سہولتیں مہیا کریں جو اس اسلامی فریضہ کو ادا کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کریں۔

۵۔ یہ کانفرنس عربی و اسلامی حکومتوں سے پوری دلسوزی کے ساتھ یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنے ہاں ایسی پارٹیاں بنانے کی دوبارہ اجازت دے دیں جن کی بنیاد نظریہ اسلامی پر ہو تاکہ وہ اسلامی تنظیمیں ان مخرب اخلاق نظریات کی بیخ کنی کریں، ان تباہ کن عوامل کو بے نقاب کریں اور استعمار کی ریشہ دوانیوں کا سدِباب کریں جن کی بنا پر ہمیں اس المیے سے دوچار ہونا پڑا۔ ہم یہ بھی اپیل کرتے ہیں کہ تساہل کی پالیسی چھوڑ کر ٹھوس سیاسی اقدامات کیے جائیں تاکہ جہادِ اسلامی کے لیے قوم کی مجموعی قوت بروئے کار آسکے۔

۶۔ عالم اسلام کے بعض حصوں میں مسلمان آپس ہی میں دست بگریباں ہیں، بالخصوص یمن اور شمالی عراق کے حصوں میں۔ یہ کانفرنس ان سے اپیل کرتی ہے کہ وہ کتاب و سنت کی پیروی کرتے ہوئے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خون سے ہولی نہ کھیلیں، بلکہ وہ آزادیٔ فلسطین کے لیے اپنی قوتیں صرف کریں، اور اس مقدس سرزمین کی واگزاری کے لیے اپنا خون بہائیں۔

یہ کانفرنس عالم اسلام کے سربراہوں سے بھی اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ کو استعمال میں لا کر ہر ممکن طریقے سے ان داخلی جھگڑوں کو ختم کرائیں جن سے اس وقت امتِ مسلمہ دوچار ہے۔

۷۔ یہ کانفرنس عربی و اسلامی ممالک سے پُرزور اپیل کرتی ہے کہ آپس کے تعلقات کو مضبوط تر کرنے کے لیے سیاسی اقتصادی، عسکری اور ثقافتی میدان میں وسیع پیمانے پر روابط قائم کریں، تاکہ اتحاد عالم اسلامی کے لیے فضا ہموار ہو سکے۔ موجودہ سنگین حالات کا تقاضا ہے کہ عالم اسلام کے سربراہوں کی کانفرنس بھی جلد از جلد منعقد کی جائے۔

۸۔ یہ کانفرنس مجاہدین کی جاں سپاری کے جذبہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور سرزمین فلسطین کو آزاد کرانے کے لیے وہ جس عزم و ہمت سے قربانیاں پیش کر رہے ہیں یہ جذبہ ان کے صادق ایمان کی نشان دہی کرتا ہے۔ جہاں یہ کانفرنس ان مجاہدین کو زبردست خراج تحسین پیش کرتی ہے، وہاں سرکاری وغیر سرکاری تنظیموں سے یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ وہ ان مجاہدین کی ہر طرح کی مادی و اخلاقی مدد کریں، اور شہدا کے پسماندگان کی کفالت کریں۔

۹۔ یہ کانفرنس رابطہ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی اور بین الاسلامی تنظیموں کی کانفرنس منعقدہ مکہ مکرمہ، اور مؤتمر البحوث الاسلامیہ منعقدہ قاہرہ کی قراردادوں کی تائید و توثیق کرتی ہے۔

۱۰۔ مسیحی دنیا کو بھی ہم اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ صہیونیوں کے خوفناک عزائم صرف اسلامی تہذیب کا خاتمہ کرنے تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ ان کے منصوبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ عیسائی تہذیب بلکہ جملہ انسانی اقدار کا بھی جنازہ نکال دیں۔ عیسائیوں کے بارے میں تو وہ روز اول ہی سے خار کھائے بیٹھے ہیں، اور ان کے خلاف ان کے دل کینہ و حسد سے لبریز ہیں۔

اس لیے یہ کانفرنس ان سے اپیل کرتی ہے کہ وہ عالمی صہیونی ریشہ دوانیوں سے پوری انسانیت کو محفوظ رکھنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کریں۔

۱۱۔ صورتِ حال اب یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسلام کے لیے عملی کام کرنے والی طاقتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر لیا جائے۔ اس لیے ہم اسلامی ممالک سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے ہاں اسلام پسند پارٹیوں پر عائد کردہ پابندیوں کو ختم کر دیں، ان کے لیڈروں کو رہا کر دیں، اور اس سخت ابتلاء کے وقت انہیں اجتماعی جدوجہد میں شامل ہونے کی اجازت دیں۔ کیونکہ بالخصوص نظریۂ اسلامی ہی ایک ایسی قوت ہے جس کی بنا پر صہیونی تحریک کو کچلا جا سکتا ہے

اس لیے یہ کسی طرح بھی صحیح نہ ہوگا کہ ہم نظریۂ اسلامی کی علمبردار تحریکوں پر پابندیاں عائد رکھیں اور ان کے

رہنماؤں کو پابہ زنجیر رکھیں۔

۱۲۔ کانفرنس میں شامل وفود نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اسلامی ممالک میں لاکھوں ایسے جری اور بہادر نوجوان موجود ہیں جو اس مقدس جہاد میں شامل ہونے کے لیے بے تاب ہیں، اور اس بات کی بھی یقین دہانی کرائی ہے کہ ان باصلاحیت نوجوانوں کی کثیر تعداد کو بڑی آسانی سے جمع کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے یہ کانفرنس اُن عرب ممالک سے امید رکھتی ہے جن کی سرحدیں اسرائیل کے ساتھ ملتی ہیں کہ وہ ایسے مجاہدین کو اس مقدس معرکہ میں شامل ہونے کے لیے ضروری سہولتیں مہیا کریں۔

۱۳۔ عالمی اسلامی تنظیمات نے اردن کے محاذِ اسلامی کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے اس طرح جمع ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اور اس رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ اس محاذ سے پورا پورا تعاون کرنا چاہیے تاکہ یہ پوری دلجمعی اور جانفشانی سے اسلامی سپرٹ کو اُجاگر کرنے اور مسلم قوتوں کو متحد کرنے میں اہم کردار ادا کر سکے۔

آخر میں یہ بھی طے پایا کہ کانفرنس میں شامل ارکان اُردن کے محاذ اسلامی کے باقاعدہ ممبر ہونگے، اور ان کے ساتھ رابطہ قائم رہے گا۔

رسائل و مسائل

خلافت و ملوکیت

سوال۔ مشکوٰۃ اور ابوداؤد کی کتاب الفتن کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض احادیث ایسی سامنے آئی ہیں جن کا صحیح مفہوم اور تشریح متعین کرنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ آپ بھی اس میں کچھ مدد فرمائیں تو مستحق شکریہ و اجر ہوں گے۔

مثال کے طور پر اس میں ایک حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الخلافة ثلثون سنة ثم یکون ملکاً۔ اس کے راوی حضرت سفینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو اس کے بعد کہتے ہیں امسك خلافة ابی بکر سنتین . . . . . وعلی ستة۔ گویا کہ اس روایت میں تیس ۳۰ برس کی خلافت اور چار خلفاء کی پیش گوئی ہے جو مسند احمد، ترمذی اور ابوداؤد میں مذکور ہے۔ لیکن اس حدیث کے ساتھ ہی مسلم اور صحاح کی بعض دوسری احادیث موجود ہیں جن میں بارہ خلفاء کا ذکر ملتا ہے جو قریش میں سے ہوں گے، اور جن سے اسلامی شان و شوکت قائم ہو گی۔ ان دو گونہ روایات کی تطبیق و تاویل پوری طرح سمجھ میں نہیں آرہی۔ منکرین حدیث بالفضل الرحمٰن اور ان کے پیشوا مستشرقین کو یہاں یہ کہنے کا موقع مل سکتا ہے کہ اہلِ سنت اور اہلِ شیعہ نے تاریخی حالات اور اپنے نظریات کو سامنے رکھ کر ایسی روایات گھڑ لی ہیں اور کتابوں میں داخل کر دی ہیں۔

دوسری حدیث حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے جس میں آنحضورؐ نے "فتنۂ احلاس" کا ذکر فرمایا ہے۔ معلوم نہیں اس فتنے سے کیا مراد ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ پھر خوشحالی اور حرب و حزب کا فتنہ ہے۔ اس حدیث کے الفاظ پُر اسرار مگر غیر واضح ہیں۔ اس میں اہلِ بیت کا ایک شخص مذکور ہے

جو ایسا ہو گا جیسے کولھا پسلی پر ہو۔ یہ شخص کون ہو سکتا ہے اور اس تشبیہ کا مطلب کیا ہے؟ یزید اور بنوامیہ کے بعض حامی ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ بعض اقوال کے مطابق یہاں عبداللہ ابن زبیر یا امام حسن یا امام حسین کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ خلافت و امارت کے لیے ان کی جدوجہد نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی اور فتنہ و فساد برپا رہا۔

اس حدیث کے بالمقابل حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت کتاب الفتن ہی میں بخاری سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کی ہلاکت قریش کے لونڈے کے ہاتھوں ہو گی۔ بعض دوسری روایات میں بھی آنحضورؐ سے مروی ہے کہ آپ نے چھوکروں کی امارت سے پناہ مانگی ہے۔ اس کا اطلاق بعض لوگ بنوامیہ پر کرتے ہیں۔ بنوامیّہ کو اس بُری پیشین گوئی کا مصداق قرار دینا کہاں تک درست ہے؟

جواب: (از غلام علی) آپ نے جن مختلف احادیث کا حوالہ دیا ہے وہ سب اپنی اپنی جگہ پر صحیح اور برحق ہیں اور ایسی تاریخی سچائیوں پر دلالت کر رہی ہیں جن کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے رسولِ مقبول صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ علیم و خبیر نے پہلے سے خبر دے دی تھی کہ اس طرح کے واقعات بعد میں رونما ہوں گے۔ جن احادیث میں خلافت کی مدت تیس برس بیان فرمائی گئی ہے اور جن میں بارہ قریشی خلفاء کی تعداد مذکور ہے، ان میں باہم کوئی تعارض نہیں ہے۔ پہلی قسم کی روایات میں خلافتِ راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ احادیث نہایت مشہور و مستفیض ہیں، جن سے خلفائے اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت کے حق میں قطعیت کے ساتھ حجت و دلیل قائم ہوتی ہے۔ آپ نے جس پہلی حدیث کا ذکر کیا ہے، اس میں حضرت سفینہؓ خود فرماتے ہیں:

امسک خلافۃ ابی بکر سنتین وخلافۃ عمر عشرۃ وعثمان اثنتی عشرۃ وعلی ستۃ۔ گویا ان کے نزدیک اس حدیث میں خلافت صدیقی، فاروقی، عثمانی اور مرتضوی علی الترتیب دو سال، دس سال، بارہ سال اور چھ سال بیان ہوئی ہے۔ اس میں تاریخی اعتبار سے پہلی دو خلافتوں میں چند ماہ کی کمی اور مؤخر الذکر میں اسی طرح کچھ اضافہ ہے۔ مگر بحیثیتِ مجموعی اس تفاوت یا کمی بیشی سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ حضرت علیؓ کی شہادت بہرحال وصالِ نبوی کے ۳۰ برس بعد ۴۰ھ میں ہوئی ہے۔ اور ایک صحابی رسول خود اس انداز میں ارشادِ نبوی کی تشریح فرما رہے ہیں جس

سے اہلِ سنت کا اجماعی عقیدہ و نظریہ آپ سے آپ واضح ہو رہا ہے۔ اس حدیث میں الخلافۃ کے الفاظ میں جن سے مراد یہ ہے کہ اپنے صحیح اور حقیقی مفہوم کے اعتبار سے خلافت وہی ہے جو اس میں بیان فرمائی گئی ہے۔

مشکوٰۃ، کتاب الفتن سے متصلاً پہلے کتاب الرقاق کے بالکل آخر میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے ایک اور حدیث ہے، جس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

تکون النبوۃ فیکم ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعہا اللہ تعالیٰ، ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ ما شاء اللہ ان تکون، ثم یرفعہا اللہ تعالیٰ ثم تکون ملکاً عاضاً فیکون ما شاء اللہ ان یکون، ثم یرفعہا اللہ تعالیٰ ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ ثم سکت۔

تمہارے درمیان نبوت رہے گی جب تک اللہ چاہے گا کہ رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے اٹھالے گا۔ پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ رہے گی جب تک اللہ نے چاہا۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے اٹھالے گا۔ پھر خونخوار بادشاہی آئے گی اور جب تک اللہ نے چاہا رہے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے بھی اٹھالے گا اور جبر و استبداد و تکبر کی حکمرانی ہوگی اور اللہ جب تک چاہے گا، اس کا دور دورہ ہوگا۔ پھر اللہ اسے بھی اٹھالے گا اور دوبارہ منہاج نبوت کے مطابق خلافت قائم ہوگی۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا۔

یہ حدیث مسند احمد، اور امام بیہقی کی دلائل النبوۃ سے مشکوٰۃ میں نقل ہوئی ہے اور اس کے ایک راوی حبیب بن سالم جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ہم عصر ہیں ان کا بیان ہے کہ جب حضرت ابن عبدالعزیز سریر آرائے خلافت ہوئے تو میں نے یہ حدیث انہیں بطور تذکیر و یاد دہانی کے لکھ کر ارسال کی اور ساتھ تحریر کیا کہ:

ارجو ان تکون امیر المومنین بعد الملك العاض والجبریۃ فسر بہ واعجبہ۔

دانتوں سے چبانے والی ملوکیت اور جابرانہ حکومت کے بعد میں امید کرتا ہوں کہ آپ ہی وہ امیر المومنین ہوں گے (جن کی خوشخبری اس حدیث میں دی گئی ہے اور جو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو از سرِ نو برپا کریں گے) اس پر حضرت عمر ثانی مسرور و شادمان ہوئے۔

اس حدیث سے دورِ خلافت اور دورِ فتن کے واقعات پر مزید روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد ملکِ عاض (یا بروایاتِ مختلفہ ملکِ عضوض[1]) اس کے بعد ملکِ جبریت اور اس کے بعد پھر دوبارہ خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا قیام ہوگا۔ اس حدیث میں بیک وقت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے لیے خوش کن بشارت اور آپ کے خاندان کے پیشروؤں کے حق میں سخت مذمت بھی تھی۔ آپ چونکہ ایک بے لوث اور خدا سے ڈرنے والے انسان تھے، اس لیے آپ نے ہمیشہ اپنے آپ کو اس عظیم خوشخبری کا اہل و مصداق ثابت کرنے کی کوشش کی، بنو امیہ کے جور و ستم کا حتی الوسع ازالہ فرمایا، حتیٰ کہ یزید کو امیرالمومنین کہنے والے پر کوڑے تک برسائے۔

دوسری روایات جن میں بارہ خلفاء کا ذکر ملتا ہے وہ بھی بلاشبہ صحیح ہے مگر اس کا مفہوم اور محمل بالکل دوسرا ہے۔ ان میں بالعموم اثنا عشر خلیفۃ کے الفاظ مروی ہیں۔ یہ روایات ہمیں صرف یہ بتاتی ہیں کہ قریش میں سے بارہ حکمران ایسے نمایاں اور سربرآوردہ ہوں گے جن کے دور میں دین و ملت اور مسلمانوں کی اجتماعیت کا شیرازہ کم و بیش بندھا رہے گا اور نظمِ مملکت درہم برہم ہو کر اختلال کا شکار نہ ہوگا۔ ان خلفاء کے نام متعین کرنے کی کوئی خاص حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بڑے تکلفات اور اشکالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم شارحین نے نام گنوانے کی کوشش کی ہے۔ بعض نے خلفائے راشدین اربعہ کو بھی اس تعداد میں شامل سمجھا ہے اور ان سے آغاز کرکے بعد کے آٹھ نام پیش کیے ہیں۔ بعض حضرات نے خلفائے راشدین کے ماسوا دوسرے بارہ امراء پر اس کا اطلاق کیا ہے۔ میرے علم کی حد تک علمائے اہلِ سنت میں سے کسی نے بھی ان احادیث کو غیر مستند یا قابلِ رد قرار نہیں دیا۔ نہ ان سے اثنا عشری ائمہ اہلِ بیت کو مراد لیا ہے۔ صحیح بات بھی یہی ہے۔ ان سے اثنا عشریہ کے ائمہ تو مراد ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ انہیں وہ سیاسی سطوت و شوکت حاصل ہی نہیں ہو سکی جو ان احادیث کے سیاقِ کلام کا مقتضیٰ ہے۔ میں وضاحتِ مدعا کے لیے یہاں سنن ابی داؤد سے دو متعلقہ احادیث نقل کیے دیتا ہوں۔ ان سے بات زیادہ صفائی کے

---

[1] مثلاً حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت آنحضورﷺ سے یہ ہے: ان ھذا الامر بدأ نبوۃ ورحمۃ ثم یکون خلافۃ ورحمۃ ثم ملکا عضوضا ثم کائن جبریۃ وعتوا وفسادا فی الارض۔۔۔۔

"اس معاملے کی ابتدا نبوت و رحمت سے ہوئی، پھر خلافت و رحمت کا عہد ہوگا، پھر ملک عضوض کا دور دورہ ہوگا اور زمین میں ظلم و فساد ہوگا"

ساتھ سمجھ میں آسکے گی۔

ابوداؤد، ابواب الفتن والملاحم کی ایک حدیث حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی زبانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں مروی ہے:

لا یزال ھذا الدین قائما حتیٰ یکون علیکم اثنا عشرۃ خلیفۃ کلہم تجتمع علیہ الامۃ کلہم من قریش۔

یہ دین اس وقت تک قائم رہے گا، جب تک کہ تم پر بارہ خلیفے نہ ہو جائیں جن پر امت جمع رہے گی اور جو سب قریش میں سے ہوں گے۔

محدث الحافظ منذریؒ کی مختصر سنن ابی داؤد میں اس حدیث پر ایک مفصل نوٹ موجود ہے جس میں فرمایا ہے:

یکون المراد بالدین، الولایۃ والملک الی ان یذھب اثنا عشر خلیفہ ثم تنتقل الامارہ وھذا علی شرح الحال فی استقامۃ السلطنۃ لا علی طریق المدح۔

دین سے یہاں مراد ولایت وسلطنت ہے۔ یہاں تک کہ بارہ خلفاء گزر جائیں گے۔ پھر امارت کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہاں محض اقتدار سلطنت کی تشریح مقصود ہے۔ یہ ارشاد بطور مدح وستائش وارد نہیں ہے۔

اس کے بعد ایک قول کے مطابق یزید سے لے کر ابراہیم بن محمد اور مروان بن محمد کے نام گنوائے گئے ہیں۔ اس کے بعد دیگر متعدد اقوال بھی نقل کیے ہیں، مگر یہ سب ظن وتخمین پر مبنی ہیں اور یہاں ان کے دہرانے کی حاجت نہیں ہے۔

انہی حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت اسی کتاب میں یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:

لا یزال الدین عزیزا الی اثنی عشر خلیفۃ ... کلہم من قریش

یہ دین غالب رہے گا بارہ خلیفوں تک ... وہ سب قریش میں سے ہوں گے۔

حافظ ابن القیمؒ اپنی تہذیب سنن ابی داؤد میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں خلافت کا لفظ حکمرانی کے عمومی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ کی حدیث میں ہے کہ:

سیکون من بعدی خلفاء یعملون بما یقولون ویفعلون ما یؤمرون وسیکون من

عنقریب میرے بعد ایسے خلفاء ہوں گے جو وہی کریں گے جو کہیں گے اور وہی کریں گے جس کا حکم انہیں ہوگا اور پھر ان کے

بعدهم خلفاء يعملون بما لا يقولون ويفعلون ما لا يؤمرون . . .

بعد ایسے خلفاء ہونگے جو ایسے افعال کریں گے جو ان کے قول کے خلاف ہونگے اور ایسے کام کریں گے جو شرعی احکام کے مطابق نہ ہونگے . . . ؟

اس حدیث میں ان لوگوں کو بھی خلفاء کہا گیا ہے جن کے قول و عمل میں مطابقت نہ ہو گی اور ان سے ایسے افعال سرزد ہوں گے جو احکامِ شریعت کے خلاف ہوں گے۔

بہر کیف خلافتِ نبوت اور مطلق خلافت و امارت سے متعلق یہ دو طرح کی پیش گوئیاں بالکل الگ الگ ہیں جن کے مصداق میں یا تو تاریخی و توصیفی اعتبار سے مغایرت و مفاصلت ہے یا پھر ان دونوں میں خصوص و عموم کا فرق ہے۔ لیکن ان کے مفہوم و مدلول میں قطعاً کوئی ایسا تعارض نہیں ہے جو کسی اشکال کا باعث بن سکے، جس سے اہلِ زیغ کوئی نادُ حاصل کر سکیں یا جسے خارجیت، ناصبیت یا شیعیت کے حامی اپنے حق میں استعمال کر سکیں یہاں ایک جگہ وثوق و تعین سے چاروں خلفائے راشدین مہدیین مراد ہیں اور دوسری جگہ عمومی طور پر بارہ خلیفوں کا ذکر ہے جو قریش میں سے ہونگے، واللہ اعلم بالصواب۔

اب اس کے بعد ہم فتنۂ احلاس[1] والی حدیث کو لیتے ہیں۔ مشکوٰۃ میں اس حدیث کے الفاظ درج ذیل ہیں: ۔

كُنّا قعوداً عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم فذكر الفتن فاكثر فی ذكرها حتى ذكر فتنة الاحلاس فقال قائل وما فتنة الاحلاس ؟ قال هی هرب وحرب ۔ ثم فتنة السراء دخنها تحت قدمی رجل من اهل بیتی یزعم انه منی ولیس منی ۔ انما اولیائی المتقون ثم یصطلح الناس علی رجل كورك علی ضلع ثم فتنة الدهیماء لا تدع احداً من

ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔ پھر آپ نے فتنوں کا ذکر فرمایا اور اسے خوب پھیلا کر بیان فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ نے فتنۂ احلاس کا ذکر کیا تو ایک شخص نے پوچھا کہ یہ فتنۂ احلاس کیا چیز ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ یہ فرار اور مار دھاڑ ہے۔ پھر ایک خوشحالی کا فتنہ ہوگا جو میرے اہلِ بیت کے ایک شخص کے قدموں سے پھوٹ پڑے گا۔ وہ مجھ سے ہونے کا دعویٰ کرے گا حالانکہ مجھے اس سے کوئی

---

[1] حلس اس سیاہ نمدے اور جھول کو کہتے ہیں جو جانور پر ڈالی جائے یا جسے فرش پر چاندنی کے نیچے بچھا دیا جائے۔ مراد کوئی ہیبتناک اور ہولناک سلسلۂ واقعات ہے جو لوگوں کو خانہ نشینی پر مجبور کر دے۔

هذه الامة الا لطمته لطمة فاذا قيل انقضت تمادت۔ يصبح الرجل فيها مومنا ويمسى كافرا حتى يصير الناس الى فسطاطين فسطاط الايمان لا نفاق فيه وفسطاط النفاق لا ايمان فيه فاذا كان ذالكم فانتظروا الدجال من يومه او من غده

واسطہ نہ ہوگا، میرے دوست اور ساتھی تو متقی افراد ہیں۔ پھر لوگ ایک دوسرے شخص پر مصالحت کریں گے جو پسلی پر کولھے کے مانند ہوگا۔ پھر ایک تیرہ و تار فتنہ ہوگا جو اس امّت کے ہر فرد کو ایک نہ ایک چانٹا رسید کرے گا۔ پھر جب کہا جائے گا کہ یہ فتنہ فرو ہوگیا تو یہ طول کھینچے گا۔ ایک شخص صبح مومن ہوگا اور شام کافر۔ یہاں تک کہ لوگ دو کیمپوں میں بٹ جائیں گے۔ ایک ایمان کا کیمپ جس میں نفاق کا وجود نہ ہوگا اور دوسرا نفاق کا کیمپ جس میں ایمان نہ ہوگا۔ جب ایسا ہو جائے تو دجّال کا انتظار کرو، آج نہیں تو کل نکلے گا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ حدیث پے در پے دو تین فتنوں سے ہمیں خبردار کر رہی ہے جن میں سے ہر ایک کے معاملے میں ہم کو اللہ سے پناہ درکار ہے (اعاذنا اللہ منہا)۔ ان میں سے ایک فتنہ ایسا ہے جس میں معلوم ہوتا ہے کہ چاروں طرف ایک لوٹ مار اور بھگدڑ مچی ہوئی ہوگی، ایک افراتفری بپا ہوگی۔ اس کے بعد دوسرا ایک فارغ البالی اور عیاشی کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا جسے اٹھانے والا خاندانِ نبوت سے منسوب تو ہوگا مگر فی الحقیقت پسرِ نوح کی طرح وہ اس نسبت و شرف کا مستحق نہ ہوگا کیونکہ آنحضورؐ کے فرمان کے مطابق آپ کے رفقاء و اولیاء تو تقویٰ شعار ہوتے ہیں۔

یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے لیکن کوئی مسلمان جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہو وہ اس بات کا تصوّر تک نہیں کر سکتا کہ اہل بیت کے جس شخص کا ذکر یہاں ہے، اس سے کوئی ادنیٰ اشارہ بھی (نعوذ باللہ) حضرات حسنینؓ کی جانب نکل سکتا ہے۔ نوخیزانِ بہشت کے ان قافلہ سالاروں (سیدا شباب اہل الجنۃ) کے تقویٰ اور طہارتِ نفس سے انکار کی جرأت آخر کیسے ہو سکتی ہے اور بھلا کیسے ہو سکتی ہے؟ اسی طرح جس شخص کا ذکر کورکٍ علیٰ ضِلَعٍ کے الفاظ سے ہوا ہے، یہاں بھی یہ باور کرنے کا قطعاً کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر جیسے جلیل القدر اور عظیم المرتبت صحابی کا ذکر آنحضورؐ نے اس انداز سے فرمایا ہوگا بلاشبہ امرِ خلافت ان کے حق میں مستقیم نہ ہو سکا، اور ان کے جامِ شہادت نوش فرمانے سے پہلے ان کی اولاد تک مروانیوں کے ساتھ جا ملی تھی لیکن

حواریٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زبیر اور ذات النطاقین حضرت اسماء رضی اللہ عنہما، کے لخت جگر کے بارے میں ایسا استعارہ کیسے آپؐ استعمال فرما سکتے تھے جس میں استخفاف کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ یہ ایسا محاورہ ہے جیسے اُردو یا انگریزی میں کہا جائے کہ فلاں شخص گاڑی کے آگے گھوڑا جوت دیا گیا ہے یا گول سوراخ میں چوکور کھونٹا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص کسی موقع و منصب کے لیے موزوں اور اہل ہو تو عربی میں کہتے ہیں: ھو کالفص فی ساعد او کساعد فی ذراع (وہ شخص انگوٹھی میں نگینہ ہے)۔

بعض اصحاب نے حدیث کے الفاظ کو بعض خاص گزشتہ واقعات اور افراد پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً شریف حسین والیٔ حجاز نے جب ترکوں سے غداری کر کے انگریزوں کی حمایت کی تھی تو اس دور کے بعض علماء نے خیال کیا کہ شاید یہی دجل کورٹ علی ضلع ہو مگر میرا ناقص گمان یہ ہے کہ ابھی تک امت ایسے فتنۂ عظیمہ سے دوچار نہیں ہوئی کیونکہ آگے کے الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ یہ فتنہ پر پڑے سنا لتا ہی چلا جائے گا، حتیٰ کہ پوری دنیا خالص ایمان اور خالص نفاق کے علمبردار دو کیمپوں میں منقسم ہو جائے گی، پھر مسیح دجال کا خروج اور مسیح ابن مریم کا نزول ہو جائے گا اور غالباً قیامت بھی دُور نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے اور ان فتنوں سے اپنی پناہ کے حصار میں رکھے۔ آمین

قریش کے جن چھوکروں کے ہاتھوں امت کی تباہی کی خبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، وہ بالکل حق ہے۔ صحیحین میں یہ احادیث موجود ہیں اور یہ بات بھی درست ہے کہ متعدد صحابہ و تابعین اور بکثرت محدثین و اصحاب سلف نے انہیں بنو مروان اور بنو امیہ کے جابر، ظالم اور شوریدہ سر امراء و عمّال پر منطبق کیا ہے۔ یہ ایک ایسی تلخ مگر ٹھوس حقیقت ہے جس سے کسی طرح اعراض ممکن ہی نہیں ہے۔ تاریخ و آثار کے صفحات سے اس سیاہی کو مٹانا یا اس پر لیپا پوتی کر کے اور سفیدی کے کوٹ چڑھا کر اس کی بدنمائی کو چھپانا، یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ مورخ ہو، محدث ہو، فقیہ ہو یا متکلم ہو، اس معاملے میں جو شخص بھی اہل سنت اور سلف صالح کے بے لاگ اور معتدل مسلک کو سامنے رکھے گا وہ ان کالک کے داغوں اور خون کے دھبوں سے صرف نظر نہیں کر سکے گا۔

طولِ بحث سے بچتے ہوئے میں سُننِ ترمذی سے ایک روایت نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ کتاب الفتن میں ہشام بن حسان کا ایک قول پوری سند کے ساتھ امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے:

احصوا ما قتل الحجاج صبراً فبلغ مائۃ الف وعشرین الف قتیل

شمار کرنے والوں نے حساب لگایا کہ حجاج نے کتنے افراد کو باندھ کر اور مشکیں کس کر قتل کیا تو ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تک پہنچی۔ یہ امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ کی روایت ہے جو امام المحدثین بخاریؒ کے شاگرد رشید ہیں اور جن سے امام بخاری نے خود حدیث اخذ کی ہے۔

ابو داؤد کتاب الفتن کی جس روایت میں امیر معاویہؓ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ہمیں ایسا اور ایسا کرنے کا حکم دیتے ہیں، یہ کنایہ و اشارہ میں بات کرنے کا ایک انداز ہے جس کا مفہوم حدیث کے سیاق و سباق سے بالکل واضح ہے۔ حدیث یہ ہے:

عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من بایع اماماً فاعطاہ صفقۃ یدہ وثمرۃ قلبہ فلیطعہ ما استطاع فان جاء آخر ینازعہ فاضربوا رقبۃ الآخر قلت: انت سمعت ھذا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال سمعتہ اذنای ووعاہ قلبی، قلت: ھذا ابن عمک معاویۃ یامرنا ان نفعل ونفعل قال اطعہ فی طاعۃ اللہ واعصہ فی معصیۃ اللہ۔

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایک امام کی بیعت کی، ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور دل و جان سے عہد کیا، اسے چاہیے کہ حتی الوسع اسی امام کی اطاعت کرے، پھر اگر دوسرا آئے جو پہلے امام سے جھگڑا کرے تو دوسرے کی گردن مار دو۔ راوی (عبدالرحمٰن) کہتے ہیں، میں نے پوچھا کہ آپ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا کہ میرے دونوں کانوں نے اسے سنا اور میرے دل نے اسے محفوظ کر لیا۔ پھر میں (راوی) نے کہا کہ آپ کے چچا زاد بھائی معاویہ ہمیں ایسے اور ایسے کام کرنے کا حکم دیتے ہیں تو حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ جس کام میں اللہ کی اطاعت ہو اس میں معاویہ کی اطاعت کرو اور جس میں معصیت ہو، اس میں ان کی نافرمانی ہو۔

حدیث کے پورے مضمون کا پس منظر صاف بتا رہا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ اپنے عہد خلافت میں بعض ایسی کارروائیاں کرتے تھے اور دوسروں کو کرنے کا حکم دیتے تھے جو حضرت عبداللہ بن عمرو اور راوی عبدالرحمٰن بن

عبدرب الکعبہ کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے منافی و مخالف تھیں۔ اس امر کی مزید وضاحت مسلم، کتاب الامارہ۔ باب الامر بالوفاء ببیعۃ الخلفاء کی حدیث سے ہوتی ہے جو اسی سند اور اسی متن کے ساتھ مروی ہے مگر اس میں نفعل و نفعل کے کنایے کو بالکل کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ حدیث کے جن الفاظ میں تشریح و تفصیل ہے، وہ یہ ہیں:

معاویۃ یامرنا ان ناکل اموالنا بیننا بالباطل ونقتل انفسنا واللہ یقول یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَیْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا قال فسکت ساعۃ ثم قال اطعہ فی طاعۃ اللہ واعصہ فی معصیۃ اللہ۔

معاویہ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم اپنے مال باطل طریق پر آپس میں کھائیں اور اپنی جانوں کو قتل کریں حالانکہ اللہ کہتا ہے کہ "اے ایمان والو! آپس میں اپنے مال باطل طریقے پر نہ کھاؤ سوائے اس کے کہ باہمی رضامندی سے تجارت ہو اور اپنوں کی جانیں قتل نہ کرو، یقیناً اللہ تم پر رحیم ہے۔" راوی کہتے ہیں کہ میری بات سن کر حضرت عبداللہ بن عمرو ایک ساعت خاموش رہے۔ پھر کہنے لگے: اللہ کی اطاعت میں معاویہؓ کی اطاعت کرو اور جب وہ معصیت کا حکم دیں تو ان کی نافرمانی کرو۔

(بقیہ اشارات)

کے لیے کافی ہے۔ ہمارے ملک کے اسلام پسند طبقوں اور خصوصاً علمائے کرام کو حالات کا آنکھیں کھول کر مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاشقند، بخارا اور سمرقند میں اسلام پر جو بیتی ہے اسے یاد رکھیے۔ حال ہی میں عراق، شام اور انڈونیشیا میں اس تحریک نے اسلام کے خلاف جس سنگین دشمنی اور جس ظلم و استبداد کا مظاہرہ کیا ہے اس سے تمام مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک کے بعض سادہ لوح افراد اشتراکیت کو محض غربت اور افلاس اور معاشی عدم مساوات دور کرنے کا ایک زود اثر اور سستا نسخہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن یہ فریب نظر ہے۔ اشتراکیت ایک ایسا نظام فکر و عمل ہے جو اسلام کی عین ضد ہے اور جس کا مقصد انسانی معاشرے کو خالص مادیت اور الحاد کی بنیادوں پر استوار کرنا ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کا مولد ایک ہی ہے۔ سرمایہ داری نے مادیت پرستی کے بطن سے جنم لیا، منفعت پرستی کی آغوش میں پرورش پائی اور قوم پرستی کی فضا میں قوت و توانائی حاصل کی۔ اشتراکیت کا درخت بھی مادیت کے بیج سے پھوٹا، منفعت پرستی نے اس کی آبیاری کی، ملکت پرستی نے اس کی شاخوں میں پھیلاؤ پیدا کیا تاکہ سرمایہ داری کا شریر بچہ اس کے سایہ میں رہ کر مذہب کے خلاف کارروائیاں کر سکے۔ ان دونوں نظاموں کا آپس میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ جب بھی سرمایہ داری پر مصیبت نازل ہوتی ہے وہ فوراً اشتراکیت کے سایہ عاطفت میں پناہ لیتی ہے۔ یہ دونوں نظام مذہب اور انسانیت کی بربادی کے درپے ہیں۔ ان دونوں کی ملی بھگت نے دنیائے اسلام پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے۔ آپ کو اگر ان دونوں نظاموں کے درمیان گہری وابستگی کا اندازہ کرنا مقصود ہو تو اشتراکی اور سرمایہ دارانہ ممالک کے درمیان اخلاقی اور تہذیبی مماثلت کا جائزہ لیجیے اور آپ کو ساری حقیقت حال معلوم ہو جائے گی۔

ہم اپنے ملک کے سنجیدہ طبقے کی خدمت میں بڑی دلسوزی کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ وہ حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کرے اور اس بات پر نگاہ رکھے کہ کہیں سرمایہ داری کی لعنت سے نجات حاصل کرتے کرتے وہ ایک دوسری لعنت

میں گرفتار تو نہیں ہو رہا۔ جسے اللہ کا دین عزیز ہے وہ کسی سرمایہ داری کا مؤید اور حامی نہیں ہو سکتا۔ آخر وہ اس حقیقت کو کس طرح نظرانداز کر سکتا ہے کہ اس سرمایہ داری نے استعماریت کو جنم دیا ہے جس نے مسلمان سلطنتوں کو تاخت و تاراج کیا اور دنیا میں ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کو بھی کبھی بھول نہیں سکتا کہ اس مزدور تحریک کو بھی جہاں جہاں کام کرنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آئے اُس نے مسلمانوں کو اُن کے دین کو اور ان کے مذہبی شعائر کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آج اگر ایک طرف ایشیا اور افریقہ کی مسلم ریاستیں سرمایہ داری کے ظلم و استبداد کی نوحہ خوان ہیں تو دوسری طرف بخارا، سمرقند، شام، عراق اور انڈونیشیا بھی سُرخ انقلاب کی تباہ کاریوں کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

گذارشات ختم کرنے سے پیشتر ایک بات ہم خاص طور پر اس ملک کے علمائے کرام سے کہنا چاہتے ہیں۔ اہل علم کے درمیان اختلاف کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ علمائے سلف میں بھی بڑے بڑے نامور اور خدا ترس افراد کے درمیان مسائل میں اختلاف ہوتا رہا ہے۔ جب تک انسان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے، اس کے فکر و نظر کے زاویوں میں بھی سو فیصد ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس اختلاف کو خدارا فطری حدود کے اندر رکھیے اور اسے اتنا نہ بڑھائیے کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن کر آپ ایک دوسرے کو مٹانے کے لیے دشمن کے ہاتھ مضبوط کرنے لگیں۔ دشمن بے حد ہوشیار اور تجربہ کار ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس اختلاف کی آڑ لے کر پہلے ایک گروہ کو اپنے ساتھ شامل کر کے دوسرے گروہ کو مٹاتا ہے اور پھر اس گروہ کو بھی نیست و نابود کر دیتا ہے۔ یہ وقت ہے کہ اُمت کے سارے علماء اور دین پسند طبقے یک جان ہو کر اس گمراہی کا پوری قوت سے مقابلہ کریں، کیونکہ اگر ایک مرتبہ اس نے قدم جما لیے تو پھر دین اور دین کا علمبردار کوئی طبقہ بھی اس کی یلغار سے محفوظ نہ رہے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حالات کے سمجھنے اور دین کی خاطر اپنی ذاتی رنجشوں اور اختلافات کو نظرانداز کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔
